اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

از

عالی جناب آنریبل شاہ سید محمد سلیمان صاحب جج ہائی کورٹ الہ آباد

یعنے

ایک عالمانہ خطبہ جو فاضل خطیب نے کانفرنس کے اجلاس مدراس سنہ ۱۹۲۷ء میں بحیثیت صدر شعبہ اصلاحِ تمدن پڑھا

جس کو

حسبِ ہدایت خاکسار آنریری سکرٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ

کانفرنس کے شعبۂ تالیف و اشاعت نے شایع کیا

صرف سرِ ورق باہتمام محمد مقتدیٰ خان شروانی

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوا ۱۳۴۷ھ ۱۹۲۸ء

فہرست مضامین رسالہ اصلاح تمدن

(مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ)

خطبۂ صدارت از آنریبل جسٹس شاہ محمد سلیمان صاحب بالقابہ

اِس میں کیا شبہ ہوسکتا ہی کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سامنے ایسے مضمون پر خطبہ دینے کے لیئے مدعو کیا جانا جو ہماری جماعت کی اخلاقی اور مادّی ترقی کی جان ہی بہت بڑی عزت افزائی ہی۔ ایک معنی سے یہ موقع انوکھا ہی کہ پہلی دفعہ ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ سوشل ریفارم سیکشن یعنی تمدنی و معاشرتی اصلاح کے شعبہ کا اضافہ کیا جارہا ہی اور ایک پُرانے خیال میں جان ڈالنے کی نام آوری کا سہرا مدراس کی مجلس استقبالیہ کے سر ہی یہ ایسی کمیٹی ہی جس نے کانفرنس کے مہمانوں کی خاطر و مدارات اور میزبانی بڑی عرق ریزی فراخدلی اور حوصلہ کے ساتھ کی ہی۔ اور اُن کو آرام و آسایش پہونچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہی۔ اسی مدراس میں ۱۹۰۱ء کا واقعہ ہی کہ پہلی پہل طویل بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے پایا تھا کہ ایجوکیشنل کانفرنس کے اغراض و مقاصد میں تمدنی اصلاح بھی شامل ہونی چاہیئے۔ اب اس مدراس کے لیئے کس قدر موزوں ہی کہ وہ ہی اس معاملہ میں پیش پیش ہی اور تمدنی اصلاح کا شعبہ ایجوکیشنل کانفرنس کا جزو لاینفک بن رہا ہی میں نے اس شعبہ کی صدارت منظور کرلی لیکن مجھے پورا علم ہی کہ یہ کام کس قدر محنت آزما اور دشوار ہی، میں اس اصلیت سے بے خبر نہیں ہوں کہ یہ موضوع کسی قدر جدید ہی اور اس کے اوپر ابھی خطبات نہیں دیئے گئے ہیں۔ لہذا یہ قدرتی امر ہی کہ میری راہ کے لیئے کوئی مشعل ہدایت پہلے سے موجود نہیں ہی اور یہ ایسا راستہ ہی جس پر کوئی راہ رو ابھی گامزن نہیں ہوا ہی لیکن باوجود اس کے میں یہ امر ظاہر کیئے بغیر نہ رہونگا کہ تمام ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے میں نے اِس دعوت کو خوشی کے ساتھ قبول کرلیا کیونکہ اس سے مجھے ایسا موقعہ ہاتھ آرہا تھا کہ اپنی جماعت کی مختلف الانواع بہبود میں شرکت کرسکوں۔

حقیقت میں عرصہ سے انڈین نیشنل کانگریس سے ایک تمدنی کانفرنس ملحق ہی اور اس میں ایسی

تمدّنی اصلاحات جن کی ہندوستان میں اشد ضرورت ہو سال بہ سال زیربحث لائی جاتی ہیں لیکن قدرتی بات ہو کہ ایسی کانفرنسیں انھیں اصلاحات پر بحث کرسکتی ہیں جن کی ہندوستان کی جماعتہائے کثیرہ کو حاجت ہو پس اسلامی جماعت کی مخصوص اور اشد ضروری اصلاحات کی طرف اِن کانفرنسوں میں کوئی خاص توجہ کیونکر ہوسکتی ہو۔

خوش نصیبی سے معاشرتی اور تمدّنی معاملات کا کوئی تعلق سیاسیات سے نہیں پس سیاسی ملحوظات درمیان نہ آنے سے دوسری جماعتوں کے حقوق کے ساتھ کوئی تصادم نہیں ہوسکتا نہ دوسروں کی مذہبی سہولتوں کو خراش پہونچنے کا کوئی گمان ہو جس سے باہمی اختلافات پیش آئیں اسلیئے تمدّنی اصلاح کے جمیع مسائل کو خالص اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے کسی کو ذرا بھی اسکا خوف نہیں ہوسکتا کہ جماعتی طرفداری کا اُس پر الزام لگے گا یا وہ اپنی جماعت کا ایسا حامی شمار کیا جائیگا جس سے ہندوستانی قومی اغراض ومقاصد کو صدمہ پہونچے۔ پس آج ہم اس مقام پر اس لیئے جمع ہوئے ہیں کہ اُن معاشرتی و تمدّنی موانع پر غور کریں جو خاصکر مسلم جماعت کا سنگِ راہ بنے ہوئے ہیں ہمارے سامنے کوئی ایسا سوال نہیں ہوسکتا کہ جس سے دوسری جماعتوں کے ساتھ مخالفت کا اظہار ہو۔ اِس میں شک نہیں کہ ہمارے موجودہ نظام معاشرت میں بے شمار نقص ہیں ہم کو لازم ہو کہ اُن کو دور کریں جب ہم مختلف مسائل کے حل کا ارادہ کریں تو اصل مرض کی تشخیص کرکے نسخہ لکھیں اور اگر دوسرے بھی اسی مرض کے مریض ہوں تو کسی رقابت یا مقابلہ کا وہاں خطرہ نہو سکے۔ امر واقعی تو یہ ہو کہ اصلاح تمدن و معاشرت ہی وہ عظیم الشان مضمون ہو جس کا میدان کا رسب جماعتوں میں مشترک ہو اور ایسا بازی گاہِ عمل ہو جس میں کامل سکون اور دوستانہ طریقہ سے اس طرح سعی کی جائے کہ سب کا بھلا ہو۔

یہ ظاہر ہو کہ جب انسانی مزاج الگ الگ ہیں۔ مذہبی تخیل جدا جُدا ہیں زندگی کے انداز اور معاش کے طریقے یکساں نہیں ہیں اس صورت میں اگر مریض ایک ہی ہو جب بھی علاج کے طریقے علٰحدہ علٰحدہ ہونگے چنانچہ ہمارا یہ فرض ہو کہ ہم اپنی جماعت کی موجودہ حالت کے متعلق اپنی توجہ کو ایک ہی مرکز پر قایم کرلیں اور یہ دیکھیں کہ کہاں پر اصلاح کی اشد ضرورت ہو۔

ہمارے نظام تمدن میں مذہبی عقائد پیوست ہیں

مسلم تہذیب اور شایستگی کا اُس وقت تک سمجھ میں آنا غیر ممکن ہو جب تک اس کی قدر نہ کی جائے

کہ مسلم جماعت کے رگ و پے میں مذہب پیوست ہے۔ آغوشِ مادر ہی سے ہمارے بچوں کے دماغوں میں مذہبی جذبات و خیالات داخل کئے جاتے ہیں۔ طفلی میں اُن کی پرورش اور تربیت کے طریقے ہرگز ہرگز صرف دنیاوی نہیں ہوتے بلکہ بہت کچھ مذہبی ہوتے ہیں۔ ہماری تہذیب مذہب کے گہرے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ ہماری ساری معاشرتی دُنیا مذہبی خیالات سے مخلوط ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ ایسے معاملات میں بھی جن میں مذہب کے دخل کی حاجت نہیں یہی خیال کیا جاتا ہے کہ مذہبی روایات اُن سے اس طرح وابستہ ہیں کہ جدا نہیں کی جاسکتیں۔ پس ہماری کوشش قدرتی طور پر یہ ہونی چاہیئے کہ مذہبی معاملات کو خالص معاشرتی معاملات سے علحدہ اور جُدا کرلیں لیکن پھر بھی ہمارا فرض اولیں یہی ہوگا کہ اسلامی تہذیب کی رعایت مدنظر رکھتے ہوئے اصلاح کریں اور اسلامی تہذیب کو خیرباد نہ کہدیں۔

تمدّنی انقلاب کی حاجت نہیں

ہندوستان کے مسلمان دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے زیادہ سرگرم مذہب اور دین دار ہیں پس ان کے ساتھ خودسر شخص کی طرح کام کرنا خطرناک ہے اور بہ یک گردشِ قلم تمامی مشرقی رسوم کو منسوخ کردینے کی کوشش کرنا بلا خیال اس کے کہ وہ رسوم کس قسم اور کس وضع کے ہیں خطرناک ہے۔ ہم ایسے پُرانے رسم و رواج کو اُس وقت تک شکست نہیں کرسکتے جب تک اُن کی جگہ دوسرے نئے قایم نہ کردیں۔ تمام ملک میں ایک جدید نظامِ تمدن جبریہ قایم کرنے کا قصد کرنا اور تمدن کی تمام عمارت کو از سرِنو تعمیر کرنا ایسا فعل ہوگا کہ اس میں کامیابی کی اُمید نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ ہمارے ملک یا جماعت میں تمدنی انقلاب برپا کرنے یا خودسر فرمان روا کی طرح فرمان جاری کردینے کی حاجت نہیں۔ ہمارے لئے بہترین طریقہ یہی ہوگا کہ مجوزہ اصلاحات کی بنا پر لوگوں کو تعلیم دیں اور اپنے عمل اور مثال دونوں سے لوگوں پر ظاہر کردیں کہ یہ بات مفید ہے۔ پُرانے رسوم کو یک لخت ترک کردینے کے بجائے کامیابی کا گمان بس اسی میں ہے کہ رفتہ رفتہ اصلاح کی جائے جو اگرچہ آہستہ آہستہ ہو لیکن یقینی مستقل طریقہ سے ہو جس بات کی حاجت ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں پر یہ نقش بٹھایا جائے کہ بعض مخصوص اصلاحات کی اشد ضرورت ہے۔ اور ایک نئے بصیرت افروز احساس سے وہ بیدار کئے جائیں۔ تا نہ موجودہ نقص کی اصلیت کو سمجھنے لگیں اور کانفرنس جن باتوں کی سفارش کرے اُن پر عمل پیرا ہونے کی ان کو ترغیب ہونے لگے۔

قبل اِس کے کہ ہم اصلاحات کی تفصیل پر نظر ڈالیں سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "اسلامی

نظامِ تمدّن کیا ہی؟ اور دُنیا کی شایستگی میں سب سے بڑی مدد اسلام نے کیا دی ہی؟ چنانچہ اس کے جواب کے لئے ہم کو احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ مذہبی اعتقادات کو یکسو رکھکر کوئی شک نہیں کہ مبادیِ اصول میں سب سے اہم اصل "انسان کی مساوات" ہی۔

مساوات

یہی وہ مسئلہ ہی جس میں بنی نوع انسان کی معاشرتی ترقی میں اسلام نے سب سے زیادہ مدد دی ہی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہی کہ اس عالم میں جو انسان پیدا ہوتے ہیں۔ ضروری ہی کہ وہ سب قوائے اخلاقی۔ دماغی اور جسمانی میں مساوی ہوں۔ ظاہر ہی کہ ان معانی کے اعتبار سے ایک باپ کے سب بیٹے بھی مساوی نہیں ہوتے۔ چنانچہ اس کا تعلق انسان کے قوائے ذہنی اور جسمانی سے نہیں ہی بلکہ سب قوموں کی معاشرتی مساوات مسلموں کی روحانی برابری سے ہی۔ جو کچھ اِس کا منشا ہی بس وہ اِسی قدر ہی کہ ذات۔ رنگ۔ آب و ہوا یا ملک کی وجہ سے کمتری کا داغ ایسا نہیں ہی جو چھوٹ نہ سکے۔ ہر ایک انسان کے لئے یہ ممکنات سے ہی کہ زُہد واتقا اور نیکوکاری کے اسی بلند مرتبہ پر فائز ہوجائے جس طرح کوئی دوسرا اِنسان فائز ہوتا ہی۔ ہمارے رسول اکرم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ کہنے کا ارشادِ ربّانی ہوا "اِنّمَا اَنَا بَشَرٌ مِثْلُکُمْ" (میں بھی تمہاری طرح ایک بشر ہوں) صرف فرق اتنا تھا کہ سچی وحی حضورِ انور پر نازل ہوئی تھی اگر ہم مسلمان اس پر بجا فخر کریں تو کیا بیجا ہی کہ دوسرے مذاہب کو دیکھتے ہوئے اسلام ہی وہ مذہب ہی جس نے انسان کی مساوات کا یوں وعظ کہا۔ اور اِس لئے اسلام ہی اس معاملہ میں سب سے برتر ہی ہم یہ مانتے ہیں کہ دوسرے بڑے مذہبوں نے بھی ایسی ہی تعلیم دی لیکن وہ تعلیم محض اصول ہی تک محدود ہی کیونکہ آج وہ کونسا مذہب ایسا ہی جس نے اس تعلیم کو واقعی عمل میں لاکر عملی جامہ بھی پہنایا ہوگا۔ ہم کو صفحاتِ تاریخ میں کوئی قدیم بڑی شائستگی ایسی نظر نہیں آتی جس نے تمام انسانوں کی معاشرتی مساوات کو قطعی طور پر تسلیم کرلیا ہو۔ معاشرت میں برتری کے جو درجے قایم ہوئے وہ اس بات کا نتیجہ تھے کہ بعض افراد کو یہ اعتقاد تھا کہ وہ کسی دیوتا کے خاندان سے تھے۔ چنانچہ اسی خیال نے کہ وہ دیوتا کی نسل سے تھے معمولی انسانوں سے اُن کو فائق اور ممتاز بنادیا۔

بابل۔ اسیریا۔ مصر کے لوگوں کا یہی اعتقاد تھا کہ اُن کے فرماں روا اور اُمرا دیوتاؤں کی اولاد سے تھے اور عوام کے مورث اور بزرگ دیوتا نہ تھے۔ چونکہ ایسی شرافتِ خاندانی کسی کے حاصل کرلینے کی

بات نہ تھی پس عوام کو ہرگز اُمید نہ ہوسکتی تھی کہ وہ خاندانی وجاہت کے اعلیٰ رستے اُمراء کے زمرے میں شامل ہوسکیں گے اور معاشرت میں اُن کا پایہ بلند ہوگا۔ چنانچہ معاشرتی افتخار خاندان کی وجاہت پر منحصر تھا اور ترکے میں پہونچتا تھا اس لیئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام قعرِ مذلت میں گر گئے جہاں وہ ہمیشہ پڑے رہے اور جماعت کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقات کے درمیان ایک دیوار حائل ہوگئی۔

غلامی کا حال کسی قدر جدا تھا اور یہ طبقہ خفیف جُدا بنیاد پر قایم تھا۔ اُس کے قومی آغاز کا حق پیدایش پر شمار نہ ہوتا تھا بلکہ حالت غلامی و اسیری سے اندازہ کیا جاتا تھا۔ غلامی جنگ کے مصائب کا نتیجہ اور مفروضہ عقیدہ کا ثمرہ تھی۔ یا قیدی کی یہ تقدیر تھی۔ جس وقت غلام آزاد ہوجاتا تھا اُس کی ذلت کا خود بخود خاتمہ ہوجاتا تھا۔ دوسرے ممالک کے قیدی یہ دعویٰ نہ کرسکتے تھے کہ وہ بھی کسی دیوتا کی اُسی طرح اولادیں تھے جیسے اُس ملک کے اُمراء تھے جہاں وہ اسیر کرکے لائے گئے تھے۔ چنانچہ دوسرے ممالک کے قیدی اکثر غلامی ہی کی حالت میں رکھے جاتے اور ادنیٰ طبقہ میں شمار ہوتے تھے، حتیٰ کہ قدیم مصری جو اقوام قدیمہ میں سب سے زیادہ رواداری برتنے والے کہے جاتے تھے اسی تمدنی تفریق سے مصیبت میں تھے۔

باوجود اپنی فلسفہ اور علم کے یونانی بھی امراء اور عوام میں منقسم تھے۔ صرف چند ایسے خاندان تھے جو اپنا شجرۂ نسب کسی دیوتا تک منسوب کرتے تھے یا کسی قدیم سورما کو اپنا مورثِ اعلیٰ بتا سکتے تھے۔ وہ رتھوں میں سوار ہوکر جنگ کرتے تھے اُس کے بعد کے زمانہ میں گھوڑوں پر سوار ہوکر لڑتے تھے۔ غریب عوام جو کسی دیوتا کی نسل سے ہونے کا دعویٰ نہ کرسکتے تھے پیادہ سپاہ میں بھرتی ہوتے تھے۔ موروثی بادشاہ جو راستی کے دیوتا کی نسل ہوتا تھا سب پر فرماں روا ہوتا تھا۔

ابتدائی اہل روما باوجود اپنے مکمل قوانین عامہ کے پاٹریشینس۔ امراء اور عوام میں منقسم تھے۔ یہی دو جماعتیں تمام ملک میں تھیں۔

یہود جو اپنے پیغمبروں کے سلسلے اور واعظین کی وجہ سے روشن خیال کہلاتے تھے یہی پختہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہی خدا کے انتخاب کردہ لوگ ہیں اور باقی انسانی نسلیں جن کو حقارت سے وہ جنٹائل کہتے تھے قومی مساوات کی اہل شمار نہ کی جاتی تھیں۔

ہندوستان کے ہندو لوگوں میں ذات کی تفریق نہایت سخت ہے احاطہ مدراس اس کی سب سے نمایاں مثال ہے۔ گورے رنگ کے آریہ وسطی ایشیا کے حدود سے آئے۔ دریائے انڈس کو عبور کیا، اور اِس

اجنبی ملک میں جہاں قدیم باشندے آباد تھے بس گئے اور اصلی سیاہ فام وحشی لوگوں کو کوشش کرنے لگے اپنی خون کی اصالت قائم رکھنے کو آریہ لوگوں نے ذات کی دیوار حائل کر دی اور برہمن چھتری - ویش اور شودر ذاتیں قائم کیں۔ چنانچہ ذات کی سختی اس حد تک عمل میں لائی گئی کہ صرف باہمی شادی بیاہ ہی ممنوع قرار نہ دیدیا گیا بلکہ کھانے پینے اور دوسرے تعلقات میں چھوت چھات کا رواج ہو گیا۔

پرانے زمانہ کی حالت کا کسی قدر اس سے اندازہ ہو سکتا ہے اگر ہم اس بڑے احاطۂ مدراس پر ایک نظر ڈالیں کہ آج یہاں کیا ہو رہا ہے۔ چھوت کا مسئلہ یہاں اس قدر سنگین اور تکلیف دہ ہے کہ کسی روحانی مصلح کی حاجت ہے جو اُٹھے اور ہمہ تن کوشش کر کے پریا اور ادنیٰ درجہ کی قوموں کی حالت سدھارے۔ اس سے خوشی ہوتی ہے کہ مہاتما گاندھی جیسا وسیع اثر والا اب چھوت کے مسئلہ کی طرف متوجہ ہوا ہے۔ اُن کی ذاتی وجاہت اور شدید کوشش سے یہ آثار نظر آتے ہیں کہ آبادی کے بڑے حصّہ کی ذلیل اور ادنیٰ حالتِ زار میں کچھ کمی ہو جائے۔ بالائی ہندوستان میں جب ہم مسلمان یہاں کی حالت سنتے ہیں تو حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ ایسے مسلمانوں کو جو اس صوبہ کے حالات سے واقف نہیں ہیں جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک پریا کس طرح جماعت سے خارج ہے اور دور دور رکھا جاتا ہے۔ کسی اونچی ذات کے برہمن کو چھو نہیں سکتا اور معمولی معاشرتی فوائد سے محروم ہے اُس کو شہریت کے عام حقوق حاصل نہیں ہیں تو یقین نہیں آتا۔

میں کسی کے مذہبی خیال کو رنج پہونچانا نہیں چاہتا کیونکہ مانی ہوئی بات ہے کہ رسوم صدیاں گذر جانے پر قائم ہوتے ہیں اور اپنے ماحول کا وہ ایک ضروری نتیجہ ہیں۔ اگر حالات مساعد ہوں۔ دلوں میں فراخی ہو۔ ہمدردی کی وضع ہو تو پُرانے قدیمی رسوم تبدیل ہو جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ ذات کے متعلق ذرا زیادہ وضاحت کرنے سے میرا منشا صرف اسی قدر ہے کہ یہ معلوم کرا دیا جائے کہ دُنیا کی شائستگی اور تہذیب میں اسلام نے کس قدر نمایاں مدد کی ہے اور صرف ایک اصول ہی بیان نہیں کر دیا ہے کہ سب انسانوں میں مساوات ہے بلکہ اپنے عمل سے بھی ثابت کر دیا ہے کہ "تمام انسان باہم مساوی ہیں"۔

اب مسیحی دُنیا کو دیکھیے کہ باوجود حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم کے وہاں بھی ایسا رواج موجود ہے جو قومی امتیاز سے خالی نہیں۔ وہاں ذات پات کی تو بحث نہیں لیکن یہ طے شدہ ہے کہ گورے چمڑے کا نارویے ٹیوٹن سلاف۔ یا لاطینی خواہ امریکہ کا ہو میکسیکو کا ہو یا برازیل کا ہو ہمیشہ ہمیشہ سنہرے رنگ کے ایرانی۔ زرد جاپانی گندمی ہندوستانی اور کالے افریقی سے فائق شمار ہوگا۔ اور اس جدید فلسفہ نے یہی بات فرض کر لی ہے چنانچہ

حالتِ آب و ہوا کسی ملک کی اوسط مقدار حرارت جس کا باشندوں کے رنگ پر اثر پڑا کرتا ہے اب معیار تہذیب و شایستگی ہے۔ یہ بات فراموش کردی گئی ہے کہ مادّہ رنگ جو انسان کے چمڑے کے اندر رکھا گیا ہے صرف اُن کیمیاوی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے جو آب و ہوا کے اختلاف سے اثر پذیر ہوتا ہے اور اسی پر رنگ کا انحصار ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے چمڑے کا رنگ فراموش کرکے مغربی دُنیا نے مسیحیت نے رنگ کے تعصب کو اس حد پر پہونچا دیا کہ ذات کا تعصب ماند پڑگیا۔ مشرقی ممالک کے گرجوں میں عبادت کے مختلف اوقات معین کردیئے گئے ہیں کہ نماز و عبادت میں بھی دو رنگ ملنے نہ پائیں۔ سامنے کی تپائیاں اعلیٰ درجہ کے لوگوں کے لیئے محفوظ رکھی جاتی ہیں۔

دوسرے مذاہب کے طرزِ عمل کو جانتے ہوئے اِس میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ اس خاص معاملہ میں دُنیا کے تمامی مذاہب سے اسلام اعلیٰ و ارفع ہے اور ہم مسلموں نے نہایت حق بجانب اس بات کا اعلان کردیا ہے۔ اُصول و عمل سے ہم نے یہ ہمیشہ تسلیم کیا ہے کہ کوئی انسان گنہگار پیدا نہیں کیا گیا ہے اور یہ کہ ہر انسان میں رَبّانی روح ہے اور تَرکے کی نوعیت جسمانی بدنمائی۔ اُس کے چمڑے کا رنگ دوسرے کے مساوی ہونے سے روک نہیں سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ دوسرا شخص صورت میں اچھا ہو لیکن روحانیت میں کمتر ہو۔ قرآن کریم میں چھبیسویں پارہ سورہ ۴۹ میں فضیلت کی یہ تعریف آئی ہے۔ "ان اکرمکم عند اللہ اتقکم" (تحقیق خدا کی نظر میں تمہارے درمیان سب سے زیادہ فضیلت اُسی کو ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے) پس ہم مسلموں کا معیارِ فضیلت نیکوکاری ہے۔ قومیت۔ ظاہری خط و خال یا چمڑے کا رنگ ہماری فضیلت کا کسی طرح معیار نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انسانی مساوات کا فلسفہ صرف اسلام ہی نے تمام دُنیا کو بتایا۔ شاید چند صدیوں کے بعد اس کی قدر اُس وقت تسلیم کی جائے گی جبکہ بین الاقوامی تمیز کو بیداری نصیب ہوگی اور قومی منافرت کا استیصال ہوگا اور بنی نوعِ انسان کی ایک بڑی برادری قایم ہوجائے گی۔

عالمگیر برادری

رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر کوہ عرفات کی بلندی سے عالمگیر اخوت و برادری پر ایک خطبہ فرمایا تھا۔ جس کے چند الفاظ مطہرہ ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔ یہ خطبہ روح ہلادینے والے الفاظ میں فرمایا ہے۔ "یاد رکھو تم سب آپس میں بھائی بھائی ہو۔ سب آدمی خدا کی نظر میں یکساں ہیں۔ اہج نسل۔ رنگ اور قوم کے امتیاز کو اپنے پاؤں کے نیچے میں کچلے دیتا ہوں۔ سب آدمی آدم کی اولاد ہیں

اور آدم خاک سے تھے"۔ اِنسانی برادری توحدا کی وحدانیت کا ایک ضروری نتیجہ ہے۔ کیونکہ سب کا وہی خالق ہے۔ پس اِنسان کی برادری اور مساوات ایسا مذہبی مسئلہ ہے جس کو بڑے فخر و مباہات کے ساتھ اسلام نے دُنیا کے روبرو پیش کیا۔ لیکن افسوس میرا فریضہ کس قدر ناخوش گوار ہو جانے کو ہے جبکہ آئندہ صفحات میں مجھے یہ بتانا ہے کہ یہی وہ اعلیٰ اور ارفع تخیل ایسا ہے کہ ہم اُس سے کوسوں دور جا پڑے ہیں۔

اِصلاحِ معاشرت

اِصلاح معاشرت کا میدان نہایت وسیع ہے اور اُس میں حسب ذیل شعبے ہیں:۔

(۱) تعلیم۔ اشد ضروری ہے جبکہ قوم اس سے دور رہو (۲) مذہب جبکہ باطل پرستی ضعف اعتقاد اور بدعات کا دُور کرنا ہو (۳) صنعت و حرفت جبکہ اقتصادی ترقی مطلوب ہو (۴) سیاسیات جبکہ تمدنی ضروریات پر حکومت سے مرافعہ کرنا لابدی ہو۔

مگر سب سے زیادہ مہتم بالشان اِصلاحِ تعلیم نسواں۔ ہم نے علوم مغربی حاصل کرنے ایک پشت بعد شروع کیئے اور اپنی جماعتی پسماندگی سے آج ایذا اُٹھا رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ نسوانی تعلیم کے اعتبار سے ہم دو پشت پیچھے ہو گئے۔ اس سے ہماری ترقی پر نہایت بُرا اثر پڑے گا۔ یہ مسئلہ چونکہ دوسرے مقدمات کا موضوع ہے میں اِس پر بحث نہ کرونگا۔ اسی طرح مذہب۔ صنعت و حرفت سیاست یہ سب موجودہ موضوع سے باہر کی بحثیں ہیں۔

صرف اِصلاح تمدن کو لیتے ہوئے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ تمدن و معاشرت کا مُدعا اور مفہوم کیا ہے۔ اصل تعریف تو بہت دشوار ہے۔ لیکن کہا جا سکتا ہے کہ ہم جماعت کو افراد کا ایسا گروہ سمجھتے ہیں جو خاص ملک میں خاص وقت پر سکونت پذیر ہو اور باہمی امداد اور نفع رسانی کی خاطر اُس کا آپس میں تعلق ہو۔ مشترک عنصر ایک جماعت میں رشتہ داری یا قومیت کا ایک ہونا ہے۔ مذہب بھی مشترک ہو۔ قومیت ایک ہو۔ ایک حکومت ہو اور زبان بھی مشترک ہو۔ مگر جماعت کے لیئے یہ لازمی اور ضروری نہیں ہے کہ یہ تمام باتیں اُس میں پائی جائیں۔ جماعت کے لیئے یہ بھی اشد ضروری نہیں ہے کہ اُس میں صرف ایک ہی نسل کے لوگ ہوں۔ نہ یہ ضرورت ہے کہ وہ مکمل قوم ہو۔ نسل اور قوم ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ واقعی دُنیا میں خالص ایک نسل کے لوگ کہیں موجود نہیں۔ اور نہ ہمیشہ کسی قوم کی صرف ایک امتیاز کرانے والی زبان ہی ہوتی ہے۔ قوم ایک جماعت ہے جو علیحدہ حکومت کے ماتحت ہو۔ سوئٹزرلینڈ کے باشندے کئی زبانیں بولتے ہیں اگر وہ ایک قوم ہیں۔ اور ایک سے زیادہ قوموں کی زبان

انگریزی ہی۔ ہندوستان کی مسلم جماعت نہ ایک نسل ہی سے ہی نہ ایک قوم ہی ہی نہ وہ ایک جدا حکومت کے تحت ہی۔ حتیٰ کہ اُس کی زبان بھی ایک نہیں۔

پس ایسی ہی جماعت کی اصلاح کا نام "اصلاحِ تمدن" ہوگا اور گمانِ غالب ہی کہ اگر اصلاح عمل میں لائی جائے تو جماعت کا ایک فرد دوسرے فرد کے واسطے مفید و کارآمد ہو جائے۔ جماعت کے باہم مفید و کارآمد ہونے سے مُراد سائنٹیفک انتظام ہی جس کے تحت عام بہبودی حاصل ہو۔ اِس کے واسطے طریق کار میں اصلاح کرنی ہوگی اور کارگر طریقے کام میں لانے پڑیں گے اور "تضیع" سے بچنا ہوگا۔ مقصد یہ ہوگا کہ محنت میں کفایت کی جائے۔ وقت رائیگاں نہ ہو محنت اور روپیہ اکارت نہ جائے۔ ایک معینہ وقت کی سعی اور محنت سے سب سے زیادہ مالی نفع ہاتھ آئے اور پیداوار جماعت کے ہر فرد کے حصّہ میں مساوات کے ساتھ پہونچے۔ اِس اہلیت کے حصول کا بہترین طریق کار ان مختصر الفاظ میں سمجھیئے کہ "اپنے کام کا ایک خاکہ بناؤ اور خاکہ پر کام کا آغاز کرو" تضیع سے بچنے کو اسی فقرہ کو چار ضروری اُصول میں پھیلاؤ۔

الف۔ ہمارا مطمح نظر محدود ہو اور پہلے ہی سے اُس کا محدود خاکہ بنالیں۔

ب۔ کام کرنے کے لیئے ہم اپنے وقت۔ مآل۔ اور محنت کا نظام العمل بنالیں۔

س۔ تمام کام ختم کردینے کی ہم عادت ڈالیں اور کام کو تعویق میں نہ چھوڑیں۔

د۔ تمام کاموں کا ہم ایک معیار قایم کرلیں۔

ہر شخص یہی کوشش کرتا ہی کہ اُس کے پاس کچھ ہو۔ وہ کچھ کرے اور وہ کچھ ہو۔ لیکن حصولِ مدعا میں معدودے چند کامیاب ہوتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ بڑا مقصد اصلاح تمدن کا جماعت کی حفاظت ہی اسی طرح اُس کی عام خوشحالی۔ اور جائز حقوق و استحقاق کی حفاظت و بقا۔ اور تمدنی بھلائی میں خوراک۔ کپڑا۔ مکان۔ آرام کا سامان۔ آسانیاں اور آسایش اور افرادِ جماعت کی ضروری تعلیم شامل ہی۔ مطمح نظر عام بہبود۔ خیریت کی عام شرائط اور فوری برآمد ہونے والے نتائج ہونے چاہیئیں۔

آخری نتائج تمدنی شخصیت سے نکلا کرتے ہیں یعنی زیادہ بلند وضع کا بالیدہ ہونا اور افضل تہذیب شائستگی کا ارتقا آخری نتائج ہیں۔

معاشرت کی قابلیت جس سائنٹیفک عمل سے وجود میں آسکتی ہی وہ یہ ہی کہ ہم اپنے ماحول کو جانچیں اور جائزہ لیں اور موجودہ نظام کی خامیاں دریافت کرکے سب سے بہتر ذریعے سے جو مہیا ہوسکیں چارہ جوئی

کریں۔ اس سے قبل تمدنی پرتال کرنی ہوگی۔ پھر بڑی غور سے ایک خاکہ تیار کیا جائے گا۔ نظام العمل نہایت منتخب قایم کرنا ہوگا کہ کار اصلاح کا آغاز ہو۔ جان اور تندرستی کی حفاظت، محنت کی تقسیم۔ کام کی درجہ وار ترتیب باہمی امداد اور اتحادِ عمل ایسے عنوان ہیں جن سے اصلاح کا راستہ ظاہر ہوتا ہے۔

پس ہمارے روبرو حسب ذیل دشوار کام ہیں:۔

۱۔ اپنی موجودہ حالت کا جائزہ اور موجودہ خامیوں کا دریافت کرنا۔

۲۔ خامیوں کی علت کا دریافت کرنا۔

۳۔ خامیوں کو دور کرنے کے بہترین طریق کار کا سوچنا۔

۴۔ ضروری اصلاحوں کو عمل میں لانا۔

میں چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے طریقہ معاشرت کی خرابیوں ان کے اسباب اور ان کے علاج سے بحث کروں اور یہ خرابیاں چار اقسام کی ہوسکتی ہیں اس لیئے میں انہیں سے ہر ایک مندرجہ ذیل عنوان پر جداگانہ بحث کرونگا۔

۱۔ وہ عادات جن کا اثر ہماری خانگی زندگی پر ہو۔

۲۔ وہ رسوم جن کا اثر ہماری اخلاقی زندگی پر ہو۔

۳۔ وہ رواجات جن کا اثر ہماری اقتصادی زندگی پر پڑتا ہے۔

۴۔ وہ مسائل جن کا اثر ہماری جماعتی زندگی پر پڑتا ہے۔

---

(۱) تمدنی عادات جو ہماری خانگی زندگی پر موثر ہیں

ذات کے خیالات ہندوؤں سے عاریتہً لیئے گئے ہیں

انسانی مساوات اور عام اخوت کا رفیع الشان تخیل جب ہم مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے موجود تھا۔ تو یہی توقع ہونی چاہیئے تھی کہ ہم ہر ایک ایسے وہم و خیال کی موج سے جس سے ہمارے اس رفیع الشان تخیل کی بنا کو ضرر پہونچتا ہو اپنی کشتی صاف بچا کر نکال لیجائیں گے۔ لیکن چونکہ ہم ایسے ملک میں جہاں نظام تمدن کے اصول میں انسانی عدم مساوات سب سے پیش پیش ہو صدیوں سے بود و باش رکھتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہم نے بھی بعض ایسے خیالات جو ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ اپنے دماغوں میں جذب کر لیئے۔ تاریخی حالات

ماتحت جن کا اعادہ یہاں فضول ہوگا آریہ قوم نے ذات کا ایسا دشوار اور سخت طریقہ قایم کر دیا کہ دنیا کے پردے پر کہیں نہیں۔ صرف یہی نہیں کہ محض وہی لوگ جو ہندو نہ تھے اچھوت اور ملیچھ خیال کیے جاتے۔ بلکہ خود ہندوؤں کے درمیان اونچی نیچی ذاتیں شودر اور اچھوت موجود ہیں۔ اپنے مدراس کے سامعین کے سامنے میرا یہ بیان کہ ذات کے انتظام سے کیا کیا مصائب پیش آرہے ہیں غیر ضروری ہے کیونکہ اچھوتوں کا سوال آپ ہی لوگوں کے سامنے مدراس میں سب سے زیادہ نمایاں طریقہ سے پیش ہے۔ ہم مسلمان صدیوں سے ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں ذات پات پر ہر بات کا مدار ہے جہاں کے ماحول میں ایسے انسانوں کو تقسیم کرکے مستقل درجے قایم کر دیتے والی اس قدر ٹھوس چیز ہے کہ اس کے اندر کوئی اثر نفوذ نہیں کر سکتا۔ تو ایسی حالت میں کیا تعجب کا مقام ہو سکتا ہے کہ اگر ہم نے بھی اپنے ملکی برادروں سے (شاید ابتدا میں محض ناسمجھی سے) کچھ ایسے وہم اور خیال مستعار لیے جو اسلامی یکسانگی کے جوہر کے قطعی مخالف و معاند تھے۔ چنانچہ بدنصیبی سے ہم نے بھی ذات پات کی تقسیم و تفریق کا براہِ راست ایک قاعدہ مقرر کر لیا ہے۔ یہ قاعدہ اگرچہ معمولی تمدنی و معاشرتی اختلاط و تعلقات میں بادی النظر میں محسوس نہیں ہوتا تاہم شادی بیاہ کے معاملات میں ایک واقعی سنگ راہ بن گیا ہے۔

بہت سے مقامات پر ہم نے سید شیخ مغل پٹھان اور دوسروں کا امتیاز اپنے تمدنی نظام میں داخل کر لیا ہے اور ان ذاتوں کے باہم یا تو شادی سے قطعی گریز کیا جاتا ہے یا کم سے کم وہ عام طور سے کی نہیں جاتیں۔ ایسی تفریق نومسلموں کے درمیان اور بھی زیادہ دیکھی جاتی ہے عرب کی قدیم روایت یہ بیشک تھی کہ نسب باپ کی طرف سے شمار کیا جاتا تھا اور اس کا مطلق لحاظ نہ ہوتا تھا کہ ماں کس قبیلہ سے آئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے کفو کے درمیان شادی کو ترجیح دی جاتی تھی لیکن کفو سے باہر جانے کی کوئی ممانعت نہیں۔ تاریخی بڑے اشخاص کے نام لینے سے میں قصداً احتراز کرتا ہوں جو ہمارے نوع بہ نوع قبائل کے نسب کا ماخذ تھے کیونکہ تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ان اشخاص کی بیویاں قریشی النسل بالکل نہ تھیں تاہم شرافتِ نسب کے فخر کو کسی طریقہ سے بٹّہ نہ لگا اور کبھی ان کے عالی نسب اور خون کی صفائی کے خلاف زبان مطاعن کھولی نہ گئی۔ عجب تماشہ ہے کہ وہاں بھی جہاں نہ تعلیم ہے نہ دولت نہ ثروت نہ درجہ نہ مرتبہ یہ نسبی فخر کا ڈھکوسلہ موجود ہے۔ یہ خیال باطل ہے کہ شرافت عالی نسبی کی مرادف ہے۔ شرافت مختلف صفات کے اجتماع کا نام ہے جو لفظ کے صحیح اطلاق کے اعتبار سے کسی کو شریف بناتی ہے۔ ان صفات میں تعلیم و دولت درجہ و مرتبہ عالی نسبی کا جزو لاینفک ہیں۔ اگر کسی میں ان صفات کے منجملہ جو شریف بنانے کے لیے لازمی ہیں ایک ہی صفت ہو تو وہ

شریف نہیں ہوسکتا۔ یہ تو قدرتی امر ہے کہ نسب تمام صفات میں سب سے بڑا مرتبہ رکھتا ہے کیونکہ نسب کوئی کسبی شے نہیں ہے۔ لیکن کسی طریقہ سے کہ صرف نسب ہی ایک اکیلی صفت نہیں ہے۔ نسب ہی تنہا دوسری ضروری صفات کو بالائے طاق نہیں رکھ سکتا ہے۔ کیسے افسوس کا مقام ہے کہ ہم نے اپنی پرانی روایات کو خیرباد کہدیا اور حد درجہ اپنے اچھوتے پن کو سخت کرلیا۔ خوش نصیبی سے سوائے باہمی شادی بیاہ کے مسئلہ کے ہمارے باہم کوئی اور قومی اور تمدنی معاشرتی امتیاز نہیں ہے اور شادی بیاہ کے معاملہ میں بھی اچھوتا پن کسی قدر معدوم ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم کو اُمید ہے یہ مصنوعی موانعات جو انسان نے پیدا کیئے ہیں قدرت خود توڑ دیگی۔

قرابتِ قریبہ میں شادی بیاہ

یہ طرفہ ماجرا ہے کہ جُدا جُدا ذات پات کا خیال ہم نے مستعار لیا تو ہندوؤں سے لیکن نتیجے اُس خیال سے نکلے اُلٹے یعنی دونوں جماعتوں کی آبادی میں ایسی نامساوات ہوگئی کہ تشبیہ باہمی دشوار ہوگئی ہندوؤں نے تو اپنی گوت (کُف) سے باہر شادی کرنے کے نظام کو غیر معمولی طریقہ سے سخت کرلیا۔ لیکن ہم مسلموں نے اس لیئے کہ دائرہ برادری تنگ تھا اپنی ہی نسل والوں کے درمیان شادی کا رواج ڈال دیا اور اکثر چچازاد ماموں زاد خالہ زاد بھائی بہنوں میں شادیاں ہونے لگیں۔ ارثی اصول صحت پر جو سائنٹیفک تحقیقاتیں حال میں ہوئی ہیں اُن کے نتیجوں کو دیکھتے ہوئے یہ بلا پس و پیش کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے جسمانی انحطاط کے جہاں اور خاص اسباب ہیں منجملہ اُن کے قرابتِ قریبہ کی شادی بھی ایک سبب ہے۔ اور ہمارے قوائے ذہنی دماغی اور جسمانی بگڑ گئے ہیں۔ بیماریاں۔ بُری عادات۔ اور اسی طرح سے جسمانی نقائص کا یہ مَیلان ہوتا ہے کہ روگی مورث کی (جو ایک درخت کے تنہ سے مشابہت رکھتا ہے) نسل میں بڑی ہٹ اور ضد کے ساتھ قایم ہو جائیں سائنٹیفک تحریرات۔ بہت بڑی مقدار شہادتوں اور نقشہ جات کی تمام علما کو یقین دلا چکی ہے کہ تمام جسمانی اور دماغی بے قاعدگی نسلاً بعد نسلٍ ترکہ میں چلی آتی ہے اور اگر یہ روگ کسی علاج سے دفع ہوسکتا ہے تو وہ علاج یہی ہے کہ مناسب طریقہ سے خون مخلوط کیئے جائیں۔ قرابتِ قریبہ کی شادی دو مختلف رُخ پر جانے والے میلانوں کے باہم آمیز ہونے کے رستہ میں حایج ہے۔ انھیں شادیوں نے کوئی موقعہ نہ چھوڑا کہ دو متضاد عناصر کے درمیان ایک بَین بَین حالت کا ارتقا ہو اور باہم آمیزش سے اُن عناصر میں ارتباط کی شکل نکل سکتی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ حاصل کردہ عادۃ ایک فرد پر بڑا اثر رکھتی ہے۔ یہی ماحول کا حال ہے۔ لیکن موروثی خصلت کی طبیعی اساس تو ہمیشہ ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ قرابتِ قریبہ میں شادیاں جسمانی خامیوں

کو دوامی کر دیتی ہیں اسی طرح موروثی بیماریوں کو مستقل بنا دیتی ہیں نئے خون کے موجود نہ ہونے سے پرانے اور دبے پڑے ہوئے قوائے ذہنی اور احساس کا نشو و نما نہیں ہوتا اور انسان کی بالیدگی دب کر رہ جاتی ہے۔ برٹ رینڈ رسل کا مقولہ ہے کہ "بنی نوع انسان کا کوئی منتخب گروہ لے لو۔ یہ گروہ علیحدہ کر لیا جائے اور اس کی بابت یہ بھی کہا جاتا ہو کہ باقیوں سے یہ گروہ نیکوکاری میں سبقت رکھتا ہے تب بھی یہ منتخب گروہ "اوسط" سے گرا ہوا ضرور بالضرور ہوگا۔ یہ قدیم ضرب المثل ہے اور بادشاہوں اور رئیسوں سے اس کا تعلق ہے جو بڑے کہلائے جاتے تھے،" سائنٹیفک وجوہ سے اس بات کا انکار ناممکن ہے کہ پشتہا پشت کی قرابتِ قریبہ کی شادیاں خاطر خواہ قابلیت کے زوال کا سبب ہیں اس رواج میں اور وجوہ بھی شامل ہیں۔ اسلامی شرعِ وراثت یہ ہے کہ جائداد ایک ہی شخص کے قبضہ میں نہ رہے بلکہ شرع شریف نے سب بیٹوں کے حقوق مساوی تسلیم کیے ہیں اور بیٹیوں اور دوسرے رشتہ داروں کو بھی حقوق دیے ہیں۔ جب جائداد چھوٹی چھوٹی کسرات میں تقسیم ہو جاتی ہے تو جلد اڑ جاتی ہے چنانچہ ایسے ہی تکلیف رساں نتیجہ سے بچنے کو والدین اکثر مصلحت سے شادیوں کا انتظام کرتے ہیں حالانکہ ابھی لڑکے لڑکی کی عمر بہت کم ہوتی ہے اصل منشا جائداد کا محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔ میاں بیوی کی مسرت اور باہمی مناسبت کا چنداں خیال نہیں کیا جاتا۔ اس کے علاوہ جھوٹے فخر بھی اکثر دیکھنے میں آتے ہیں کہ ایک مبالغہ آمیز شرف نسب کسی خاص خاندان سے منسوب کیا جاتا ہے اور دوسرے گرے درجہ کے شمار کیے جاتے ہیں اور باہمی شادی بیاہ میں پس و پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے دائرہ انتخاب بہت تنگ ہو جاتا ہے اور باہمی قرابتِ قریبہ میں شادیاں محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ ان تمام اسباب نے متحد ہو کر ہماری جماعت پر منحوس اثر ڈال رکھا ہے اور ہمارے نشو و نما اور ترقی کے رستہ میں حائل ہے۔

ضرورت ہے کہ عام رائے میں وسعت پیدا کیجائے

ہمارا فرضِ اولین یہ ہونا چاہیے کہ ذات کے مستعار خیال کے چھوڑ دینے کی لوگوں کو ترغیب دیں اور اسلامی اخوت و مساوات کی تعلیم کی طرف توجہ کریں۔ ہمیں ضرورت ہے کہ سائنٹیفک خیالات کی اشاعت کریں اور ارث کے اصول واضح کریں اور لوگوں کو متنبہ کریں کہ قرابت قریبہ میں شادی کرنے سے کیسے ضرر ہیں۔ اگر اس بلا سے نجات کی کوئی صورت ہے تو بس یہی ہے کہ عام رائے میں روشنی پیدا کی جائے اور اپنی جماعت کے ارکین کو تعلیم دی جائے۔ یہ بلا تو ہم کو اپنے شکنجہ میں کستی چلی جاتی ہے اور ہماری جسمانی بالیدگی کو اس نے روک دیا ہے دیسی زبان کے اخباروں کا یہ وقیع فرض ہے کہ عوام کو اس دھوکے سے نکالیں کیونکہ ان

اخباروں کا دائرۂ اثر بہت زیادہ ہے اور اس نقصان کی جڑ کھود کر پھینک دینے کے قوی آلے اخبار نویسوں کے ہاتھ میں ہیں۔

نوعمری کی شادی

ہم یہ خیال کیا کرتے ہیں کہ نوعمری کی شادیاں (یعنی سنِ بلوغ سے پہلے کی) ہم لوگوں میں عموماً بہت سے نہیں کی جاتیں اور اُن کا سوائے بعض نیچی ذاتوں - زیادہ تر نو مسلموں میں رواج ہے - نو مسلم بھی وہی جو ہندو سے مسلمان ہوئے ہیں لیکن جب یہ بتایا جائے گا کہ دس سال سے نیچی عمر میں شادیوں کی نسبت ہندوؤں کے ساتھ ہم مسلموں کی قریباً نصف ہے تو ہم میں سے بہت سے حیرت زدہ ہو کر چونک پڑیں گے۔ اسی طرح دس اور پندرہ برس کے درمیان شادیوں کی نسبت تین چوتھائی ہے۔ چونکہ ہم ہندو جماعت کے درمیان نہایت زمانۂ دراز سے ہیں اور ہندو جماعت ایسی شادیوں کو مذہبی احترام کی نظر سے دیکھتی ہے تو کیسے ممکن تھا کہ یہ چھوت ہم کو نہ لگتی - بے شک وشبہ نوعمری میں شادی کر دینے کی ابتدا کا سبب یہ بات ہوئی ہے کہ والدین اپنی بیٹیوں کی حفاظت اور امن کا سامان مہیا کریں - قدیم زمانہ میں آئے دن جنگ وجدل کا سامنا تھا۔ چنانچہ حفاظت کی خاطر باپ کو ان لڑائیوں میں لڑ کر مرجانا بھی پڑتا تھا - پس یہی ضروری خیال کیا گیا کہ کسی کو داماد بنا لیا جائے کہ اگر لڑکی کا باپ لڑائی میں کام آجائے تو داماد لڑکی کا محافظ باقی رہے - نوعمری کی شادیاں عصمت و اخلاق کی بھی محافظ یقین کیجاتی تھیں - چنانچہ جب یہ مدِ نظر ہوا کہ بیٹی کی عصمت و اخلاق کی حفاظت ہو تو یہ قصد کر لیا گیا کہ جس قدر جلد موقعہ ہاتھ آئے لڑکی کی حفاظت کا انتظام کر دیا جائے اگر باپ لڑائی میں مارا جائے - دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں جس عمر میں شادیاں کی جاتی ہیں اس ملک میں عمر کے اعتبار سے اُن کا معیار گھٹا ہوا ہے - بد قسمتی سے یہ بات بھی ذہن نشین نہیں ہوئی ہے کہ صرف سنِ بلوغ کو پہونچنا پختگی کے لئے کافی نہیں ہے - چنانچہ لڑکا جب تک پورا مرد نہ ہو جائے اور لڑکی پوری عورت نہ ہو جائے اُس وقت تک ظاہر ہے کہ شادی قبل از وقت ہے - شادی کا مناسب وقت تب آتا ہے جبکہ بالیدگی پوری ہو چکے - نہ کہ بالغ ہوئے اور شادی کر دی گئی - یہ بتانا کہ کس عمر میں پختگی آتی ہے ناممکن ہے لیکن یہ کہنا آسان ہے کہ جبتک جسمانی بالیدگی کا عمل جاری رہے پختگی کا وقت نہیں آتا پختگی کا وقت جب ہی آتا ہے کہ جسمانی نشو ونما ختم ہو - اُن لوگوں کے واسطے جو ہندوستان میں رہتے ہیں تخمیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ شادی کا مناسب وقت مرد کے واسطے کم سے کم بیس سال کی عمر ہے اور عموماً بائیس[۲۲] اور پچیس[۲۵] سال کے درمیان اور عورت کے واسطے کم سے کم سولہ سال اور عموماً اٹھارہ اور بیس سال کی عمر - خاص مزاجوں کی

حالت میں اِن حدود کے درمیان تھوڑی تبدیلی بھی ہو سکتی ہے۔

یہ بات بڑی تاکید سے کہی جا سکتی ہے کہ شادی کا ایسے وقت میں کر دیا جانا جبکہ جسمانی نشوونما ہنوز جاری ہے۔ بالیدگی کے لئے مضر ہے اور بالیدگی کو روکتا ہے۔ طبّی نقطۂ نظر سے اِس زمانہ میں شادی مصیبت کہی گئی ہے اور قوانینِ فطرت کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ یہ ضرر رساں اثر صرف میاں بیوی پر یا صرف ماں ہی پر اگر قبل از وقت اُس کے بچّہ ہو جائے نہیں پڑتا بلکہ خود بچہ پر بھی پڑتا ہے اور یہی اثر اگر نسلاً بعد نسلٍ جاری رہے تو تمام نسل کو خراب کر دیتا ہے۔ چنانچہ نو عمری کی شادی کے نقصان وہ نتیجے صاف طریقہ سے ظاہر ہیں۔ ان ہی نتیجوں کی بدولت لڑکیوں کو مناسب تعلیم بھی نہیں دی جا سکتی اور لڑکیاں نہایت خسارہ میں رہتی ہیں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ عورتوں کا درجہ گرتا جاتا ہے۔ ایک اور نتیجہ بھی عیاں ہے۔ یعنی بچپن کی شادی ہونے کے سبب کثرت سے بیوائیں بڑھتی چلی جاتی ہیں اور بیوگی کے ہمراہ جو مصائب ہوتے ہیں ان کا اضافہ ہوتا ہے۔ پس والدین کا صرف یہی فرض نہیں ہے کہ اپنی اولاد کی شادی کر دیں بلکہ اُن کا فرض یہ ہے کہ اولاد کی عمروں کے لحاظ سے دیکھیں کہ وہ شادی کے مناسب ہیں پس جب تک ہماری جماعت اِس بلا اور آفت کی طرف سے بیدار نہ ہوگی تو جیسا پشتہا پشت سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ ہماری نسلیں بد سے بدتر ہوتی چلی جائینگی۔ اور ترقی یافتہ اقوامِ عالم سے ہم درجہ میں اور زیادہ گھٹ جائیں گے۔

صرف ایک عورت سے شادی

اگرچہ بلاشک و اشتباہ شادی ایک وقیع اور اخلاقی عہد و پیمان ہے۔ لیکن درحقیقت خاص طور پر یہ وہ تمدّنی رسم ہے جس سے ایک قوم کی عام فراوانی۔ بقا۔ ترقی اور خوشحالی پر اثر پڑتا ہے۔ زمانہائے ماضی میں جبکہ تہذیب و شائستگی میں قومیں پیچھے تھیں بلا امتیاز گروہوں میں شادیاں ہوتی تھیں۔ ایک بیوی کے ایک ساتھ کئی کئی شوہروں اور ایک مرد کی بے قید تعداد سے بیویاں رکھنے کا عام رواج تھا۔ ماحول کے حالات دیکھنے سے ہر شخص کو یقین ہو جائے گا کہ ان خاص صورتوں کا رواج انھیں حالات میں ہوا جو قوم کی ضروریات کے مناسب حال کسی خاص حالت میں تھے جنمیں وہ قوم ہوتی تھی یا جن حالات میں کشاکشی سے وہ قوم زندگی بسر کرتی تھی۔

تعددِ ازدواج تمدّنی رواج کی حیثیت سے مفقود ہوتا جاتا ہے حالانکہ اس تعداد کی کسی مذہب نے ممانعت نہ کی۔ حتیٰ کہ قدیم یونانیوں نے کثرتِ ازدواج کو خلافِ قانون خیال نہ کیا کیونکہ اسکندرِ اعظم اور اُس کے باپ فلپ کی

ایک سے زیادہ بیویاں تھیں۔

قدیم مصریوں میں اس کا پورا رواج تھا۔ بابل کا مجموعہ قوانین حامو ربی اس کی صحیح ممانعت نہیں کرتا بلکہ ایسی صورتوں کے جواز کو مانتا ہے جہاں دوسری بیوی سے شادی کر لی جائے۔

تعددِ ازدواج کی آریا لوگوں نے قانونی اجازت ہی نہ دی بلکہ ایک بیوی کے ایک وقت میں کئی شوہر رکھنے کو بھی جائز رکھا۔ جیسا پانڈوں کی بیوی دروپدی کا واقعہ موجود ہے۔ مگر مابعد کے زمانہ میں یہ رواج کم ہو گیا اب ہمالیہ کی بعض قوموں جنوبی ہندوستان کے حصوں کے سوا یہ رواج اور کہیں نہیں ہے۔

عبرانیوں میں تعداد ازدواج کی پوری اجازت تھی اور اُن کے رسولوں نے بیویوں کی تعداد میں کوئی قید نہ لگائی۔ یہودی شرع کے موافق بہت سی بیویاں رکھنے میں کوئی گناہ نہ تھا حتیٰ کہ قانونی مرتبہ میں بھی بیویوں کے کوئی فرق نہ تھا۔ بے اولاد بھاوج سے شادی کی اجازت تھی۔ اور ڈیوٹرونومی کتاب نے بے اولاد والی بیوہ بھاوج سے شادی کرنا لازمی قرار دیا۔ بیویوں کی تعداد کے متعلق کہ ایک مرد کتنی رکھے کوئی حد مقرر نہ تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کے دو بیویاں تھیں۔ حضرت داؤدؑ کے بے شمار بیویاں تھیں۔ حضرت سلیمان کے سات سو بیویاں تھیں ان کے علاوہ تین سو داشتہ عورتیں تھیں لیکن تالمود نے یہ تعلیم دی کہ ایک مرد کے چار سے زیادہ بیویاں نہ ہونی چاہئیں۔ گو کہ مسیحیت ایک ہی بیوی کرنے کی حامی خیال کی گئی ہے لیکن عہد نامہ جدید (انجیل) میں واقعی کوئی واضح آیت موجود نہیں جس میں تعداد ازدواج کی ممانعت ہو۔ اس معاملہ میں حضرت مسیح نے یہودی قانون کے اندر مداخلت نہ کی بلکہ اُس کو جوں کا توں چھوڑ دیا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ابتدائی عیسوی صدیوں میں جو عیسائی کونسلیں منعقد ہوئیں اُنھوں نے بھی تعداد ازدواج کی مخالفت نہ کی چنانچہ عیسائی دُنیا میں پہلی دو صدیوں کے درمیان تعداد ازدواج کا رواج تھا۔ اس میں شک نہیں کہ رومی تہذیب نے جس سے عیسائیت بہت ملتی ہے ایک ہی بیوی سے شادی کرنے کو شادی کی مناسب صنع تسلیم کیا اور اُس کی رجعت سے رفتہ رفتہ تعداد ازدواج مفقود ہوا۔ چنانچہ مغرب میں جو ایک ہی بیوی سے شادی کرنے کا سخت رواج قایم ہوا اُس کا سبب رومی اثر ہی تھا۔ آٹھویں صدی میں شارلیمان بادشاہ کو لے لو چشارلیمان بڑا مبلغ تھا۔ تمام عمر تبلیغی جنگیں اور فتوحات پہ فتوحات کرتا رہا۔ اس کو ہولی سیلچر (پاک مقبرہ) کی کنجیاں دی گئیں اور یہ عیسائی دُنیا کا محافظ تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن اس شارلیمان کی بھی تو وقتِ واحد میں دو بیویاں تھیں مطلقہ بیویاں اور داشتہ عورتیں ان دو کے علاوہ تھیں۔ پچھلے زمانہ میں فلپ فرمانروائے

ہیسی۔ اور فریڈرک ولیم ثانی نے لوتھر فرقہ کے پادریوں کی اجازت سے دو دو بیویوں سے شادی کی ۱۶۴۸ء میں ویسٹ فیلیا کی صلح کے بعد ہی جس سے جنگ سی سالہ کا یورپ میں خاتمہ ہوا فرینکش کریس ٹیگ نے نوریم برگ میں یہ طے کیا کہ آئندہ ایک مرد دو بیویوں سے شادی کرے۔ اور اینی بیپٹسٹ فرقہ نے تو یہ وعظ کہا کہ جو شخص عیسائی ہونا چاہتا ہے اُس کو ضرور بالضرور کئی بیویاں رکھنی چاہیئے۔ اور مارمونس تو تعدد ازدواج کو اَب بھی ربّانی قانون خیال کرتے ہیں۔

تمدّنی حالات کی تبدیلی سے اب یورپ اور امریکہ میں صرف ایک ہی بیوی سے شادی کا رواج قایم ہوگیا ہے اور صلی اور وقتی عمدرآمد کا لحاظ رکھتے ہوئے تمام اسلامی ممالک میں سوائے چند مستثنیات کے ایک ہی بیوی سے شادی کی جاتی ہے۔ عورتوں کی آزادی اور خودمختاری کے ساتھ یہ خیالات بھی پیدا ہو چلے ہیں کہ مرد اور عورت میں مساوات ہے۔ اس برابری کے دعوے سے بھی ایک ہی بیوی کرنے کا میلان ترقی کر رہا ہے۔ سوکنوں کی آپس کی ڈاہ اور کُنبہ کے جھگڑوں کا بھی مرد کو تجربہ ہوا۔ اس تجربہ نے سکھایا کہ ایک ہی بیوی پر قناعت کی جائے۔ اس کے سوا اقتصادی بار اور زندگی کا سامان مہیّا کرنے کی کشمکش بھی اسی خیال کے موید ہوئی کہ ایک ہی بیوی کی جائے۔ جس قدر تہذیب و شائستگی میں ترقی ہوئی ایک ہی بیوی سے شادی کی طرف رجحان بڑھا اور بڑا کُنبہ ایک بوجھ ثابت ہوا۔ اس کی خواہش باقی نہیں ہے کہ کثرت سے اولاد ہو۔ بیویاں اپنے شوہروں کی رفیق ہو رہی ہیں۔ مردوں کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ گرہستی کی اصلی مسرت صرف ایک ہی بیوی سے حاصل ہوسکتی ہے بہت سی بیویوں سے یہ خوشی میسر نہیں آسکتی۔ چنانچہ تمدّنی حالات نے ایک ایسی حد قایم کردی جس کی تصریح مذہب نے نہ کی تھی۔

عرب کے زمانہ جاہلیت میں دوسرے ممالک کی تہذیب کے موافق کوئی حد مقرر نہ تھی کہ کتنی بیویوں سے ایک مرد شادی کرے۔ ہمارے معظم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلی دفعہ بیویوں کی تعداد کی وہ حد مقرر فرمائی جو تالمود میں متعین ہے۔ لیکن اس میں بھی شرط لگادی کہ اُس کا پورا ہونا آسان نہ تھا اور وہ یہ شرط ہے کہ "بیویوں کے ساتھ قطعی مساوات کا سلوک ہو"۔ یہ ثابت کرنے کو کہ قرآن مجید نے تعدد ازدواج کو کس قدر دُشوار کر دیا ہے میں صرف دو آیتوں کا بلا تفسیر حوالہ دیتا ہوں۔

۱۔ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً۔ پھر اگر ڈرو کہ برابر نہ رکھوگے تو ایک ہی (بیوی سے نکاح کرو)

سورۂ النساء (رکوع ۱)

۲۔ وَلَنْ تَسْتَطِيعُوْا أَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ۔ اور تم ہرگز برابر نہ رکھ سکو گے عورتوں کو اگرچہ اس کی حرص کرو (کہ تم برابر رکھو گے) سورۂ النساء رکوع ۱۹۔

اِن احکام کا میلان یہ ہے کہ تعدد ازدواج ایک استثنا کی شکل میں رہے اور وہ کوئی عام قاعدہ نہ بنجائے چنانچہ اسی مصلحت کا یہ نتیجہ ہے کہ تمامی اسلامی ممالک میں یہی عام عمل ہے کہ ایک ہی بیوی کی جاتی ہے اور باوجودیکہ تعدد ازدواج کا مذہبی قانون موجود ہے تعدد ازدواج عام نہیں ہے۔ ہندوستان میں بھی یہ ہی عملدرآمد ہے۔ اگرچہ دو ایک حالتوں میں اس کے خلاف بھی دیکھا جاتا ہے۔ اَب اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وقت آگیا ہے کہ اس معاملہ کو خالص تمدّنی نقطۂ نظر سے ہاتھ میں لیا جائے اور شدّت کے ساتھ تعدد ازدواج کے خلاف احتجاج کیا جائے کہ وہ مفقود ہی ہو جائے۔ عورتوں کی تمدنی ترقی۔ زندگی کی صعب کشمکش، اچھے گھر کی حاجت۔ تندرست بچوں کے پالنے کی ضرورت سب ہی تو اس کے متقاضی ہیں کہ گھر میں اتحاد ہو۔ اَن بَن و پھوٹ نہ ہو۔ جواز کے سوال کو چھوڑ کر ہم کو یہ خیال کرنا لازمی ہے کہ تعدد ازدواج قرین مصلحت نہیں ہے۔ اور پھر جو اِکّا دُکّا مثالیں نظر بھی آتی ہیں وہ بھی معدوم ہو جائیں گی۔ مسلم عورتوں کا مسلم مردوں سے تعداد میں جب مقابلہ کیا جاتا ہے تو نو بٹا دس کی نسبت ہے اس طرح ایک ہی بیوی سے شادی کرنا تمدنی ضرورت ہے اور عام تعدد ازدواج غیر ممکن ہے۔

بے جوڑ شادیاں

بھلا اس سے اور زیادہ کیا شقاوت و ظلم ہوگا کہ بوڑھے رنڈوے ایسی لڑکیوں سے شادی کریں جنھوں نے اپنی عمر کا ابھی اُنیسواں سال بھی ختم نہ کیا ہو۔ لڑکی کے والدین کی سنگ دِلی اور بے پروائی سے ایسی بے جوڑ شادیاں عمل میں آتی ہیں۔ یہ والدین صرف مالی فائدہ کو دیکھتے اور میاں بیوی کے جوڑ اور مناسبت یا موزونیت اور باہمی مسرت پر نظر نہیں کرتے۔ پس اس بے حیائی سے لڑکی کے محسوسات کا لحاظ نہ کرنا نہایت تاسف کی بات ہے۔ تمام عمر کے واسطے لڑکی بھینٹ چڑھا دی جاتی ہے اور یہ صرف فوری مالی مفاد کی خاطر کیا جاتا ہے اور یہ فعل نہایت مذموم ہے۔ ہندوستان میں شادیاں والدین کی مرضی پر منحصر ہیں۔ پس والدین کا فرض ہے کہ جنکی دلچسپی اور خیریت و بہبود کا اِن والدین پر انحصار ہو اُن لڑکی لڑکوں کا لحاظ رکھیں۔ اِس قسم کی شادیاں جن میں عمر کی یوں نامساوات ہو خلافِ فطرت ہیں اور اِن سے نہایت بد نتائج نکلتے ہیں۔ یا تو لڑکی قبل از وقت بیوہ ہو جاتی ہے یا میاں بیوی کے باہم سوءِ مزاجی کے سبب تمام عمر کی مصیبت اور جلنا ہوتا ہے۔

۱۹ ارث اور ناپسندیدہ افزائش نسل

دوسرے مضمون پر بحث کرنے سے پہلے میں ایک ایسے معاملے پر کچھ کہنا چاہتا ہوں جو معرضِ بحث میں چلا آتا ہے اور اُس پر احتیاط کے ساتھ اظہار خیال ہونا چاہیئے۔ اگر اس معاملہ میں مَیں قطعی اور صریح رائے کا اظہار نہ کروں اور صاف صاف الفاظ استعمال نہ کروں تو معذور رکھے جانے کے قابل ہوں۔ وہ مشکل سوال کثرت پیدائش کا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں پیدائش کثرت سے ہوتی ہے لیکن جس طرح کثرت سے بچے پیدا ہوتے ہیں اُسی طرح فوتی کی بھی کثرت ہے۔ چنانچہ میں یہ کہنے کی جرأت نہ کرونگا کہ ہندوستان میں اتنی آبادی بڑھ گئی ہے کہ وہ حد سے زیادہ ہے یا پیدائش کی کثرت جاری ہے۔ لیکن یہ بات تو بلاخوف تردید کہی سکتی ہو کہ بہت سے بچے جو پیدا ہوتے ہیں اُن کا نہ پیدا ہونا ہی بہتر تھا۔ مَیں مالتھوزین اصول کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا جس کا منشا یہ ہے کہ زمین کی پیداوار حسابی قاعدہ کی نسبت سے بڑھتی ہے پس وہ آبادی کی افزائش کا ساتھ نہیں دیسکتی اور یہ آبادی کی فراوانی اگر روکی نہ گئی تو کئی گونہ ترقی کرجائے گی۔ نہ میں فیلس عقیدہ سے بحث کرونگا جس کو مسولائنی نے ترقی دی کہ ملک کی ترقی کے واسطے پیدائش میں فراوانی اشد ضروری ہے۔ تاریخ نے ہم کو یہ تجربہ کرادیا ہے کہ شائستہ صنعت وحرفت کی پیداوار آبادی کی افزائش کے مقابلہ میں تیز تر بڑھتی ہے پچھلی صدی میں انگلستان کی آبادی کثرت سے بڑھ گئی ہے لیکن دولت اُس سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ انگلستان نے اپنی صنعت وحرفت کو مُرتب کیا اور اُس کی پیداوار صرف اسی قدر نہ ہوئی کہ انگلستان کی آبادی کو کفایت کرتی بلکہ اس قدر سرمایہ موجود رہا کہ خود ملک کے اندر سود پر لگایا گیا اور دوسری حکومتوں کو جو سلطنتِ برطانیہ سے متعلق ہیں باہر بھیجا گیا۔ پس یہ ضروری نہیں ہے کہ مالتھس نے جو یقین کرلیا ہے کہ دُنیا کی آبادی فضول ہے صحیح ہو۔ ہاں یہ ضرور سچ ہے کہ ہر ملک میں نکھٹو اور ناقابل لوگ ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ لائق اشخاص کی بھی کمی ہے۔ چنانچہ اصل چیز تعداد نہیں ہے بلکہ آبادی کی قابلیت ہے۔ یہ تاریخی بدنصیبی کا واقعہ ہے کہ قابلیت کی صلاحیت اور اُس کا بقا پیدائش کی نسبت کی برعکس ہے۔ چنانچہ اچھی طرح دیکھ لیجئے کہ ہر ملک میں سب سے زیادہ صاحبِ اولاد وہی لوگ ہیں جو سب سے زیادہ ناقابل ہیں۔ اور جو گروہ محنت دماغی اور جسمانی قابلیت قوتِ ترتیب اور انتظام مملکت کے لیئے ممتاز ہیں اُن کے درمیان اولاد کی پیدائش اوسط سے گری ہوئی ہے۔ بڑے آدمی ہمیشہ چند اور کمیاب ہوتے ہیں۔ پس جو لوگ فرائض والدینی کا سب سے زیادہ احساس رکھتے ہیں اُن کے درمیان اولاد کم نظر آتی ہے اس کے خلاف ادنےٰ طبقہ کے لوگوں میں اولاد کا کچھ شمار نہیں اور اس کثرتِ اولاد سے

نسل کی ترقی کو کوئی فائدہ نہیں۔ چنانچہ قابل طبقات میں اولاد کی کمی نسل کے انحطاط کا موجب ہی۔ جو طبقے گھٹ رہے ہیں معدوم ہو جائیں گے۔ اور دوسرے گروہوں کی اولاد اُن کی جگہ کو پُر کرے گی۔ اور اس کے یہ معنی ہونگے کہ فاقہ زدوں اور لاغروں کی کثرت ہو جائے گی پس اگر اُن لوگوں میں جو دور اندیش۔ نیکی۔ روشن خیال اور تعلیم یافتہ ہیں۔ ہر پشت کے بعد اولاد گھٹتی گئی تو ہماری نسل کے بہترین عناصر رفتہ رفتہ معدوم ہو جائینگے اور اُن کی جگہ بدترین لوگ قایم ہو جائینگے بہترین درجے کے لوگوں میں اولاد کم ہونا قابل افسوس بات ہی اسی طرح ادنیٰ درجہ کے لوگوں میں بچّوں کا کثرت سے پیدا ہونا جو اپنے بچّوں کو تعلیم نہیں دلا سکتے۔ نہ اُن کو اُجلا ستھرا صاف رکھ سکتے ہیں نہ اُن کو اچھا کھانا کپڑا دے سکتے ہیں قطعی مفید نہیں ہی کیونکہ اس کا اثر یہی ہوگا کہ ہماری قابلیت کا معیار گِر جائے گا۔ مالتھیوزین اصول۔ کہ آبادی کا آگے ترقی کرنا روکا جائے ایک وقت تک کافی درست تھا لیکن اس میں اب ان الفاظ سے اصلاح ہونی چاہیئے کہ تندرست۔ ہنرمند۔ اور مستقل پیشہ رکھنے والوں کے درمیان زیادہ اولاد ہونی چاہیئے۔ ان کے خلاف اُن لوگوں میں جو نسبتاً پیچھے ہٹے ہوئے ہیں۔ اور ناقابل ہیں۔ اولاد کم ہونی چاہیئے۔ پس اگر ان حکیمانہ اصول سے چشم پوشی کی گئی تو ملک کی اِس سے زیادہ بُری خدمت اور کوئی نہ ہو گی۔

ہم میں سے بہتوں کو یہ تجربہ ہی کہ بعض لوگوں کی مالی حالت بڑے کنبہ کی اجازت نہیں دیتی اور وہ بہت سے بچوں کی پرورش نہیں کرتے۔ اُن کے بچّے غیر تعلیم یافتہ رہتے ہیں۔ پیٹ بھر کر اُن کو کھانا نہیں ملتا۔ کپڑے ردی ہوتے ہیں اُن کی اچھی داشت نہیں ہوتی۔ اُن کو طرح طرح کے روگ لگے رہتے ہیں اگر وہ قبل از وقت مر نہیں جاتے تو اُن کی زندگی تو ضرور ناکام رہتی ہی اور جماعت میں وہ ایک بار ہو جاتے ہیں۔ پس والدین کو سمجھنا چاہیئے کہ زندگی کا مقصد صرف بچہ کشی ہی نہیں ہی بلکہ تندرست اولاد کا پالنا ہی کہ آئندہ کی نسل کے لیئے اچھا سرمایہ مہیّا ہو چار پانچ بچے کافی ہیں۔ پس ناپسندیدہ بچّوں کی پیدایش اسی طرح روکی جا سکتی ہی کہ پیدایش کی احتیاط کے ساتھ روک ٹوک کی جائے لیکن ایسی تدابیر ابھی ہندوستان میں معلوم نہیں ہیں لیکن وقت آگیا ہی جبکہ پیدایش میں روک ٹوک لوگوں کو معلوم کرائی جائے تاکہ جن لوگوں کو اس کی ضرورت ہی وہ بوجہ ناواقفیت خسارہ میں نہ رہیں۔

صرف مصنوعی ذرائع ہی سے پیدایش میں کمی کی جا سکتی ہی اور بجائے ناپسندیدہ کثرتِ پیدایش کے ایک بہتر قسم کی نسل اور بہتر درجہ کی اولاد پیدا ہو سکتی ہی اور اِس سے اوسط معیار بلند ہو جائے گا۔

۲۱
بیواؤں کی دوسری شادی

تمام عمر کی بیوگی سے جس کا ہندوستان میں تکلیف دہ رواج ہو رہا ہے اسلامی تہذیب و شائستگی کے اساسی اصول سے خلاف تر کوئی دوسرا رواج نہیں ہے۔ قرآن مجید میں صاف حکم موجود ہے کہ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ "یعنی اور نہیں گناہ تم پر جو پردے میں کہو پیغام نکاح کا (بیوہ) عورت کو (سورۃ البقر رکوع ۳۰)

مزید آں حضور اکرم جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنی مثال دکھائی اور بیوہ عورتوں سے نکاح کیئے تاکہ پس و پیش اور اکراہ اور پرانے خیالات دور ہو جائیں۔ چنانچہ حضور اکرمؐ کی نہایت قابل ستائش مثال کہ آپ نے بیوہ اور مطلقہ عورتوں سے نکاح کیئے دنیا کے سامنے اس بات کا ثبوت تھا کہ ایسے نکاحوں میں نہ تو کوئی کسر شان ہی تھی نہ کوئی بات قابل اعتراض تھی۔ چونکہ ہنگامی ضرورت تھی اور جنگوں نے مردوں کو آبادی میں سے بہت سے مرد چن لیئے تھے مسلم جماعت میں اس رواج کی جڑ نہایت مستحکم ہو گئی اور پھر یہ رواج مغربی ایشیا اور شمالی مشرقی افریقہ میں پھیل گیا۔ لیکن مسلمانوں کا ہندوستان میں آریہ شائستگی اور تہذیب سے واسطہ پڑا۔ آریہ لوگوں میں نہ تو بیوہ کی دوسری شادی ہی کی جاتی تھی نہ اُن میں طلاق کی رسم تھی۔ چنانچہ ہندوستان کے مسلمانوں پر بالواسطہ اس کا اثر پڑا۔ اگرچہ نہ قانون سے ممانعت ہے نہ مذہب سے اور اگرچہ مذہب نے کھلے الفاظ میں اجازت دیدی ہے۔ لیکن ہندو تمدن سے ایسا قریبی واسطہ پڑا کہ تمامی عملی مقاصد کے باوجود صدیوں سے اعلےٰ اور متوسطین مسلمانوں کے درمیان بیوہ کا دوسرا نکاح قطعی مفقود ہو گیا۔ اور یہ عمل کنواری لڑکیوں کی شادی کے جس کا اس مُلک میں عام دستور ہے قطعی ضد اور مخالف ہے۔ مگر یہ فالِ نیک ہے کہ نئی پود بیووں کے دوسرے نکاح کی طرف مائل ہے اگرچہ پُرانی روش کے لوگ اب بھی راہ میں حائل ہیں۔ رجعت کا نیا احساس شروع ہو گیا ہے اور اُس کا اچھا اثر ہو رہا ہے۔ لیکن ابھی اس معاملہ میں ترقی کی رفتار بہت سُست ہے اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ہماری ہموطن جماعت (ہندو) نے اس سمت قدم نہیں بڑھایا ہے جب ہم اپنے پرانے اسلامی رواج کی طرف عود کر آئیں گے تو وہ ہمارے لیئے بڑا خوش نصیبی کا وقت ہو گا۔ اور یہ اسلامی رواج اسلامی ممالک میں آج موجود ہے۔ اس رجعت سے ہماری عورتوں کا پایہ بلند ہو جائے گا جو کنیزوں کی طرح ابھی مردوں کے تحت میں ہیں اور پھر جیسا اسلام کا حکم ہے مردوں کے ساتھ اُن کو مساوات حاصل ہو جائیگی۔

طلاق[22]

مسیحی مذہب کے رومن کیتھولک نقطۂ نظر سے اگرچہ طلاق ناجائز کہی گئی ہے لیکن پروٹسٹنٹ عقیدہ نے طلاق جائز کی اور اب مسیحی یورپ و امریکہ کے درمیان یہ طلاق قانون کا ایک جزو بن گئی ہے۔ امر واقعی یہی ہے کہ مناسب اور حق بجانب حالات میں اگر میاں بیوی میں طلاق کے ذریعہ سے جدائی کی سہولت نے بجائے تو تجربہ نے اس ضرورت کو ثابت کر دیا ہے۔ امریکا میں اور بھی بڑی سہولتیں اس طلاق کے معاملہ میں موجود ہیں۔ امریکا عورتوں کی آزادی کے لحاظ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔

اسلام نے ابتدا ہی سے طلاق کی اجازت دی اور یہ تسلیم کیا کہ عملی طریقہ سے قطعی غیر ممکن ہے کہ رشتۂ نکاح ایسا ہو سکے کہ وہ کبھی توڑا ہی نہ جا سکے۔ لیکن۔ اگرچہ ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے طلاق کی اجازت تو دی لیکن طلاق کے عام عمل کو قطعی ملعون بھی فرمایا ہے یعنی فرمایا "تمام چیزوں میں جو آدمی کے لئے جائز کی گئی ہیں ان میں سب سے زیادہ نفرت اللہ کو طلاق سے ہے"۔ لیکن خوش نصیبی سے اسلامی ہندوستان میں طلاق کا رواج شاذ ہے۔ اگرچہ کبھی نہایت مغلوب الغضبی کی حالت میں طلاق کا واقعہ پیش آجاتا ہے۔ اور اسکو بھی (کیونکہ ایسی طلاقوں سے بڑی مصیبت اور سختی پیش آجایا کرتی ہے) عام رائے کے ذریعہ سے روک دینا چاہیئے۔ ہمیں یہ حقیقت جاننا چاہیئے کہ مرد کو جو عورت کو طلاق دینے کا اختیار دیا گیا ہے وہ نہایت ہی خصوصی حالات میں دیا گیا ہے اور جس میں سخت احتیاط اور غور و فکر کی شرط ہے۔ جب کوئی اور چارہ کار باقی ہی نہ رہے تو طلاق دی جانی چاہیئے۔ پس ظاہر ہے کہ مرد کو طلاق دینے کا اختیار یوں نہیں دیدیا گیا ہے کہ متلون مزاجی سے ترنگ میں اٹھائی اور جھٹ سے طلاق دے دی۔

ایک طرف تو مرد کو یہ اختیار ہے کہ ایسے رشتۂ نکاح کو ساقط کر دے جس سے طرح طرح کی مایوسی اور مصیبت کا سامنا ہوتا ہو مگر دوسری طرف عورت کی دادرسی کا کوئی آلہ موجود نہیں اور اگر ہے تو بس اسی قدر ہے کہ پیچ در پیچ غیر یقینی نالش اور مقدمہ بازی کی جائے جس میں شدید مصارف کرنے پڑتے ہیں۔ ابتدائی عدالت میں جائے پھر اپیل و مرافعہ سے چارہ جوئی کرے اگر شوہر سے واقعی علٰحدگی کی ضرورت ہو۔ بہت سے پکے دیندار مسلمان جن کا یہ عقیدہ ہے کہ خُلع سوائے مسلم قاضی کے فتوے کے حاصل نہیں ہو سکتا اِس بات کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ گورنمنٹ سے استدعا کریں کہ چند منتخب قاضیوں کو آنریری مجسٹریٹی اور آنریری منصفی کے اختیارات دیدیئے جائیں جن کے فیصلے خاص اور مستحق حالات میں با اختیار عدالت کے فیصلوں کی طرح ناطق ہوں۔ یہ

ایسا ارزاں اور آسانی سے حاصل ہو جانے والا علاج ہے جس کی زمانہ دراز سے حاجت محسوس ہو رہی ہے۔ پھر جماعت میں وہ قدرتی انتشار نہ ہوگا جو مایوسی کی حالت میں پیدا ہو جاتا ہے جبکہ کوئی اور چارہ کار باقی نہیں رہتا

زچہّ اور بچہّ

ہندوستان کی (فوتی) کے نقشہ جات دیکھنے سے حیرت ہو جائے گی کہ اس ملک میں کس کثرت سے بچے مرتے ہیں۔ کیا آپنے اس کے سبب کی اصلیت پر بھی کبھی غور کی ہے۔ مذہبی مسئلہ تقدیر پر میں بحث کرنی نہیں چاہتا کہ مرنا جینا سب تقدیر سے متعلق بات ہے لیکن وہ بھی جو "تقدیر کے قایل ہیں جانتے ہیں کہ اسلام نے سعی اور تدبیر کی بھی تاکید فرمائی ہے اور مذہب یہ توقع کرتا ہے کہ مُسلم موت سے بچنے کی حتی الوسع سعی اور تدبیر کرے اور تندرستی قایم رکھنے کو ہر کوشش عمل میں لائے۔ کوئی شبہ نہ ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں! اس کی صداقت نیویارک اور لندن کی شرح اموات میں کمی ہو جانے سے ہوتی ہے جہاں زچہّ خانہ کے دوران میں بہتر اور اصلاحی طریقوں سے کام لیا جاتا ہے۔

زچہّ خانہ میں حفظان صحت کے بہتر طریقے تازہ ہوا اور صفائی۔ اچھی غذا۔ تربیت شدہ دایہ سے کام لینا از حد ضروری ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں کہ ہمارے متوسطین اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں میں اُن پر توجہ نہیں کیجاتی۔ زچہّ جس کمرہ میں رکھی جائے اُس میں تازہ ہوا کا کافی گزر ہو اچھی طرح روشنی آئے۔ دھوپ کی حدّت نہ ہو۔ یہی وہ باتیں ہیں جو زچہّ اور بچہّ کی جلد صحت اور تندرستی کے لیئے ضروری ہیں۔

ہندوستان کے بعض شہروں میں جہاں محنت کرنے والے صنعت وحرفت کے کارخانوں کی وجہ سے زیادہ آباد ہیں شرح اموات فی ہزار پانسو سے لیکر چھ سو تک ہے۔ یہ شرح ایسی ہے کہ ہول طاری کر دیتی ہے اور بدن پر رعشہ کی نوبت آجاتی ہے۔ انگلستان میں شرح اموات صرف ستّر فی ہزار ہے اور نیوزی لینڈ میں صرف ستّر ہے۔ ہندوستان میں پیدا ہونے والے بچوں میں فی ہزار تین سو پچاس تو ایک سال کے بھی نہیں ہونے پاتے کہ مر جاتے ہیں۔ اسی طرح بچوں کی ماؤں کی شرح اموات مغربی ممالک سے بہت اونچی ہے ۱۹۲۵ء کی کمشنر حفظان صحت کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان اور ویلز سے مقابلہ کرتے ہوئے اب ہندوستان کی شرح اموات میں کچھ کمی نظر آتی ہے۔ باایں ہمہ اب بھی تمام دُنیا میں ہمارا بیچارہ ہندوستان متعدی امراض کا گھر ہے مختصر یہ کہ بچوں اور اُن کی ماؤں کی موتیں ہماری قوم کی جان کا رَس چوسے لیتی ہیں۔

ابھی ہم نے پوری طرح سے اس اصلیت کو نہیں جانا ہے کہ ہندوستان میں کس قدر شدت سے موتیں

ہوتی ہیں۔ اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ زچہ اور بچہ کی حفاظت کی انجمنوں کی شدید ضرورت کی طرف سے ہم بیدار نہیں ہوئے ہیں۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ یہ معاملہ کہ ہندوستان میں سالانہ بیس اور تیس لاکھ کے درمیان ایسے بچے مرجاتے ہیں جو ایک برس کے بھی ہونے نہیں پاتے کس قدر بڑا معاملہ ہے۔ اور اگر ہم یہ دیکھیں کہ یورپ اور امریکہ کے مقابلہ میں ہندوستان کے اندر بچوں کی شرح اموات پنچگونہ زیادہ ہے اور پھر ہم اس پر بھی غور کریں کہ زچہ خانہ کے متعلق حفظان صحت کے مفید طریقے کام میں لانے سے کس قدر حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے تو مجھے اعتماد ہے کہ سال بہ سال بچوں کا اس کثرت سے ضایع جانا اگر قطعی بند نہ ہوجائے گا تو اُس میں کمی تو ضرور ہو جائے گی۔

ملک کے اصلی نقصان کا صرف اسی سے اندازہ نہیں ہوتا کہ کس قدر بڑی تعداد میں اپنی زندگی کے ابتدائی سالوں میں بچے مرتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی تو دیکھنا چاہیئے کہ کس قدر بچوں اور اُن کی ماؤں کی تندرستی بگڑ کر رہ جاتی ہے اور بقیہ عمر یہ داستانِ غم جاری رہ کر آخر قبل از وقت موت کے ساتھ اس داستان غم کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ مغربی ممالک میں زندگی (عمر) کا اوسط چالیس اور پچاس سال کے درمیان ہے۔ لیکن اس کے خلاف ہندوؤں کی عمروں کا اوسط پچیس اعشاریہ ایک (۲۵ء۱) سال اور مسلمانوں کی عمروں کا اوسط چوبیس اعشاریہ ایک (۲۴ء۱) سال ہے۔ پس انسانوں کے ایسے بڑے اتلافِ جان کو روکنے کے لیئے ہم کو لازم ہے کہ اس تحریک میں پورا زور لگائیں اور جہاں تک امکان میں ہو اس تحریک میں مدد دیں اور ہمت افزائی سے کام لیں۔

ہندوستان ہی ایسا ملک ہے جہاں اس قسم کی مناسب منتظم تحویز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ کیونکہ یہاں آبادی کے دل کے دل خصوصاً غربا میں ایسے موجود ہیں جو صاف ہوا کے سادہ قواعد سے بھی قطعی ناواقف ہیں اور نہایت کثرت سے بچوں کا اتلافِ جان اس لیئے ہوتا ہے کہ صفائی کی معمولی احتیاطیں بھی عمل میں نہیں لائی جاتیں اور بچوں کی تندرستی کی طرف سے بے پروائی کی جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ خراب گھروں غربا موکھانے۔ میلے کپڑوں اور دوسرے خلاف تندرستی اسباب پر لوگوں کی عُسرت کا بھی اثر ہے۔ لیکن اگر لوگوں کی اس مہیب بڑی جہالت کو ہم دور کرسکیں اور ہم لوگوں کو یہ سمجھادیں کہ اُن کی عدم توجہی اور بے پروائی سے اُن کے بچوں کی جان کس قدر خطرہ میں ہے۔ تو بہت کچھ اصلاح ہوسکتی ہے۔

مَیں نہیں خیال کرسکتا کہ جوان ناخواندہ عورتوں اور خصوصاً حاملہ عورتوں کو صاف ہوا کے سادہ قواعد عملی طریقہ سے بتا دینے سے کوئی اور دوسری بات زیادہ مفید۔ زیادہ ضروری اور کارآمد ہوسکتی ہے۔ ماؤں کو اپنی اور اپنے بچوں کی تندرستی کی خاطر یہ قواعد جاننے چاہییں۔ بہت سے مقامات پر زچہ اور بچہ کی عافیت کے متعلق

مرکز قایم ہو چکے ہیں۔ اور نیشنل بے بی ویکس (بچوں کے قومی ہفتے) اس لیئے ترتیب دیئے گئے ہیں کہ جاہل طبقات کو ترقی یافتہ سائنٹفک صفائی اور اچھی ہوا کے طریقوں سے واقف کریں۔ بچہ ہونے کی حالت میں مفت امداد دی جاتی ہے۔ غریبوں کے گھروں پر ڈاکٹری مدد کے واسطے جانے کا اہتمام ہوا ہوا ہے یہ سب اس لیئے ہے کہ جاہل لوگوں کو تعلیم دی جائے۔ زچہ اور بچہ کی عافیت کی جو انجمنیں قایم ہوئی ہیں ہم کو اُن سے بچنا اور علحدہ رہنا نہ چاہیے بلکہ تمامی معاملات میں مشورہ اور مدد لینی چاہیے۔ ایسی انجمنوں کا نیچے طبقات تک نفوذ نہیں ہوا ہے اور غریب لوگوں کے درمیان کافی اثر کے ساتھ اُن کی رسائی نہیں ہوئی ہے۔ بڑے اور چھوٹے اشتہار یا رسالے جو جاری کئے اور چھاپے جاتے ہیں اُنھوں نے ابھی جاہل لوگوں کو مَس نہیں کیا ہے۔ نہ اُن پر اثر ہوا ہے۔ ہماری جماعت کی طرف سے اس تجویز کو کامیاب بنانے میں سعی ہونی چاہیئے اور میں آپ لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ ایسی انجمنوں کی حمایت فرمائیں اور جہاں تک ہو سکے ان میں پوری امداد دیں اور اُس کو تندرستی عامّہ میں ترقی کا ایک قدرتی ذریعہ خیال کریں۔ نئی نسلوں کی بہبود پر ان کا بہت کچھ اثر ہوگا۔ اور ملک کو بہت نفع پہونچے گا۔

باطل پرستی کے عقائد

اِس سلسلہ میں ایک اور سوال ہے جس پر مجھے کچھ کہنا چاہیئے۔ غُرباء میں بہت سے رسوم جن کا ملک میں رواج ہو گیا ہے باطل پرستی کے عقائد سے ملے ہوئے ہیں اور یقیناً اُن کو ہمارے بڑے مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ زچہ کا ایک بند مقام پر جہاں ہَوا کی آمد و رفت نہیں اس لیئے بند کر دینا کہ بچہ نظر بد سے محفوظ رہے۔ اور آسیب کے گزند سے بچانے کو دِن رات کمرہ میں تیل کا چراغ اور آگ روشن رکھنا۔ کیونکہ اِن آسیبوں کے متعلق خیال ہے کہ اندھیرے کمرے میں دخل کرتے ہیں۔ یا ماں کا کثیف اور مَیلا رکھا جانا اور افلاس کے سبب سے اُس کے کپڑے مَیلے اور غلیظ رکھنا ایسے اُمور ہیں جن کا بہ آسانی تدارک ہو سکتا ہے اگر میاں بیوی کو یقین دلا دیا جائے کہ یہ باطل پرستیاں نرا ڈھکوسلا ہیں۔ یہ اعتقاد بھی عمومیت کے ساتھ رواج پا گیا ہے کہ بچہ تازہ ہَوا اور آفتاب کی روشنی سے بچایا جائے اور ماں یا دایہ کی گود میں کپڑے میں لپٹا پڑا رکھا جائے اور بستر پر نہ لٹایا جائے کہ اپنے ہاتھ پاؤں مار کر قدرتی ورزش کرے جس سے اُس کا نشو و نما جلد ہو اور دودھ ہضم ہو۔

بعض ایسے رواج ہیں جن کا مدتوں سے عمل چلا آرہا ہے اور حفظان صحت کے اصولوں کے قطعی

خلاف ہیں اور ان سے منشا صرف اسی قدر ہوتا ہے کہ ماں اور بچہ مضر اثرات سے محفوظ رکھے جائیں۔ گویا یہ خیال ہے کہ دونوں دوسرے لوگوں کی نظروں کے خطرے میں ہیں اور اُن پر آسیب کا حملہ ہو جائے گا پس خاص حفاظت کی ضرورت ہے اور صفائی نہ ہونی چاہیئے۔ چالیس دن تک سب دروازے اور کھڑکیاں بند رکھی جاتی ہیں اور یہ بچّہ پیدا ہونے کے دن سے کیا جاتا ہے اور یہ اس خیال سے کہ آسیب اندر نہ آنے پائیں۔ ماں اور بچّہ کو گزند نہ پہونچائیں۔ تیل کے چراغ اور آگ برابر روشن رکھی جاتی ہے اور دھوئیں کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا جو پیدا ہوتا اور کمرے میں گھٹتا ہے اور جس سے ہوا ایسی ہو جاتی ہے کہ دَم رُکنے لگتا ہے۔ ایسی احمقانہ رسموں پر عمل کیا جاتا ہے کہ ماں اور بچہ دونوں کی صحت بھینٹ چڑھ جاتی ہے اور ایسی حماقت کی کارروائیاں کی جاتی ہیں کہ وہ صرف غیر ضروری ہی نہیں بلکہ مضر ہیں۔ چنانچہ جدید سائنس سے جو تجربات اور تحقیقاتیں ہوئی ہیں ہمیں اُن کی طرف سے غافل نہ ہونا چاہیئے۔ اور پُرانی فرسودہ زمانہ وسطےٰ کی وہم پرستیاں چھوڑ دینی لازم ہے۔ نہایت بے خوفی سے اِن مسائل حل کرنے کی اَب ہم کو سعی کرنا چاہیئے۔

پردے کا رواج

پردے کا سوال کسی قدر مذہبی سوال ہے اور ایسے موقعہ پر جیسا یہ ہے میں اُس بحث سے اجتناب کرونگا جو مذہبی طریقہ سے پردے کے متعلق ہوتی رہتی ہے۔ ایک طرف تو اس میں چوں وچرا کی گنجایش نہیں کہ اسلام نے پردے کے متعلق یہ حکم دیا ہے کہ عورتیں اپنے "محاسن" عام نگاہ سے محفوظ رکھیں دوسری طرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ شمالی ہندوستان میں جس انتہائی حد کو پردہ پہونچا دیا گیا ہے وہ حد کسی اسلامی ملک میں نہیں پائی جاتی۔ عورتوں کے متعلق قرآن مجید کا یہ حکم کہ "وہ اپنی زینت کا اظہار نہ کریں" یہ ایسا حکم ہے جسکی مختلف طریقے سے تاویلیں کی گئی ہیں لیکن اُن لوگوں کے نزدیک بھی جو "زینت" کے معنی صرف زیور ہی نہیں لیتے بلکہ جسم کے حُسن کو بھی اُس میں شامل کرتے ہیں اِس کی اجازت ہے کہ ہاتھ اور چہرہ عورت کھول سکتی ہے۔ میرا ہرگز ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ مذہبی بحث ومباحثہ میں پڑوں۔ میں ہدآیہ سے جو سنیوں کی مشہور فقہ کی کتاب ہے صرف اتنا اقتباس کرتا ہوں کہ "اس کی اجازت نہیں ہے کہ مرد عورتوں کے چہرے اور ہاتھ کی ہتیلیوں کے سوائے کچھ اور دیکھیں۔ اور بس اسی قدر اجازت ہے۔ کیونکہ عورتوں کا کام کاج سے تعلق رہتا ہے اور یہ تعلق مردوں سے لین دین وغیرہ کا ہوتا ہے۔ پس اگر بدن کے یہ حصّے بھی پوشیدہ کیئے جائیں تو

بڑی دشواری ہو گی۔ پس ضرورت ہے کہ یہ حصے کھلے رہیں" (کتاب چہاردہم۔ باب ۴۔ فقرہ ۱۱)) اس اقتباس سے
میرا مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ اوائل زمانۂ اسلام میں کیا تھا اور شمالی ہندوستان میں آج کیا ہو رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں جو پردے کی شدت کی یہ حد ہو گئی ہے اس کی ابتدا یہ تھی کہ زمانۂ وسطیٰ میں جب مسلم حملہ آور ہندوستان میں آئے تو اُن کی جماعت بہت قلیل تھی اور اُن کو اغیار کی بہت بڑی جماعت کے درمیان رہنا پڑا۔ عورتوں کی حفاظت سے جان و مال کی حفاظت زیادہ ضروری نہ تھی۔ چونکہ مَردوں کو گھروں سے باہر جنگ میں جانا پڑتا تھا پس ہر وقت وہ اپنی عورتوں کے قریب نہ رہ سکتے تھے۔ چنانچہ اُس جدال و قتال اور لوٹ مار کے زمانہ میں مَردوں کے سامنے صرف یہی راستہ کھُلا ہوا تھا کہ عورتوں کو زنانہ میں بند کر دیں اس طرح عورتوں کے لیئے قدرتی اور محفوظ حفاظت مہیا کریں۔ اُس زمانہ کی متصل جنگ نے جس میں خونریزیاں ہوتی تھیں پردے کے رواج کو زیادہ سخت کر دیا اور آخر اس قدر قیدیں لگا دی گئیں جو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ بدقسمتی سے ملک کی حالت ایسی واقع ہوئی تھی کہ نقاب ڈال کر بھی مسلم عورتوں کو گھروں سے باہر جانا دُشوار تھا اور اس سے عورتیں چلنے پھرنے کی آزادی سے محروم ہو گئیں لیکن اس آزادی کا اُن کی بہنیں عرب۔ ٹرکی۔ مصر۔ ایران۔ افغانستان۔ اور شمالی افریقہ میں لطف اُٹھا رہی ہیں۔ کوئی بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ عورتوں کو زنانہ کی چار دیواری کے اندر محبوس کر دینے کے متعلق کوئی آیۃ یا حدیث موجود ہے۔ یہ بدقسمتی کا نتیجہ محض تمدنی رواجوں کے غالب آنے اور پھیلنے سے برآمد ہوا۔ لیکن الحمدللہ کہ وہ سخت زمانہ اب بہت عرصہ ہوا کہ گزر چکا اور بیسویں صدی میں ہم ایسے زمانہ میں رہتے ہیں کہ نسبتاً بہت امن چین ہے۔ زمانہ ماضی کے تمدنی حالات گزر گئے اور معدوم ہو گئے۔ اور متبدل حالات سے نئی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ پس ہمارا بڑا فرض ہے کہ حالات کا از سرِ نو جائزہ لیں اور دیکھیں کہ ہمارے لیئے اَب پُرانی بندش و سختی کس قدر مطلوب یا حق بجانب ہے۔

اگر پردے کا رواج محض امراء اور اونچے درجوں تک محدود ہوتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا کیونکہ اِن اونچے درجے کی خواتین کو معاشرتی میل جول کے موقعے ملتے ہیں۔ گھروں کے اندر آسایش ہے۔ زنانہ باغیچوں میں تازہ ہوا میسّر ہے اور اپنی ہم رُتبہ خواتین سے مُلاقاتوں کے موقعے ملتے رہتے ہیں۔ لیکن اس سخت پردے کی رسم نے ستم ڈھایا ہے تو متوسطین کی مستورات کی جان پر کہ اِن دُکھیاریوں کو اپنے تنگ زنانوں میں کوئی آرام و آسائش کا سامان میسر نہیں۔ نہ اُن کو ورزش نصیب ہے نہ تازہ ہوا۔ نہ زندگی کی کوئی اور معاشرتی سہولتیں

اس میں کیا شبہ ہی کہ اگر وہ اپنے حال پر صابر و شاکر ہیں تو اُس کا سبب یہی ہی کہ اُن کو اپنی مصائب کی واقعیت کا علم نہیں ہی اور واقعہ یہ ہی کہ اُن کی صحت خراب ہو جاتی ہی۔ اُن کو مہلک بیماریاں ہو جاتی ہیں جن کا اثر اولاد پر پڑ کر نسل کو بدتر بنا رہا ہی۔ خوب کہا ہی کہ "جماعت کی اصلی شیرازہ بندی یہ ہی کہ عورتوں کا درجہ بلند کیا جائے۔ یہی عورتیں نسل کی محافظ ہیں اور قوم کے مستقبل کے واسطے سامان مہیّا کرتی ہیں" غور تو فرمائیے کہ اگر آبادی کا آدھا حِصّہ دَوامی طریقہ سے پیچھے ہٹا دیا جائے تو ہم کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ اُن کے بچّے دوسری جماعتوں کے بچوں کے ہمسر اور مقابلہ میں اوسط سے اونچے ہونگے۔ ہم میں سے ایسا کوئی ہی جس کو یہ تجربہ نہ ہوا ہوگا کہ نیچے درجہ کی عورتیں جو باہر نکلتی تازہ ہَوا میں پھرتی اور پردہ نہیں کرتیں۔ اور گھر سے باہر چُستی سے زندگی بسر کرتی ہیں زنانے مکان کے اسیر خواتین سے ہر حال میں تنومند اور مزاج کی مضبوط تر ہوتی ہیں۔

یہ تو ہر ایک مانتا ہی کہ موجودہ رواجی پردے میں بڑی بڑی خرابیاں ہیں۔ لیکن جو پردے کے حامی ہیں وہ یہی خیال کر رہے ہیں کہ پَردے کی وجہ سے زیادہ بڑی بڑی بُرائیوں سے امن ہی۔ کوئی شخص جس نے مغربی تہذیب کی خرابیوں کی طرف سے قصداً آنکھیں نہ بند کر لی ہوں۔ یا اُس کو ان خرابیوں کے پوشیدہ کرنے کی غرض ہو۔ اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ عورتوں اور مردوں کو بے قید ملنے جلنے دیا جائے تو ضرور نقصان اور خرابیاں ہیں۔ مشرقی دماغ اُس بے قید آزادی کو جو مغرب میں عورتوں کو حاصل ہی اس نگاہ سے دیکھتا ہی کہ یہ آزادی دوسری حد کے پار جا رہی ہی لیکن مغرب میں بھی صرف پادریوں ہی کے درمیان نہیں بلکہ مُدبّرین میں ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ صلیبت محسوس کرتے ہیں کہ پانی سر سے اونچا ہو گیا۔ پس کیا تعجب ہے اگر کوئی ٹھیٹھ ہندوستانی بہ حفظ ماتقدم کرے کہ مغربی چھوت اُس کی مستورات کو نہ لگے۔ اِس کے خلاف ہر ایک صاحبِ انصاف کو تسلیم کرنا چاہیئے کہ یہ بھونڈا نظارہ کس قدر مضحکہ خیز ہی کہ ایک معزز خاتون چار کرایہ کے کہاروں کے کندھوں پر بند پالکی میں سوار چلی جا رہی ہی۔ اور یہ کس قدر بے معنی بات ہی کہ ہماری خواتین ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں یوں ناچار بنا دی جائیں۔ اگر ہم کو دو مصیبتوں کا سامنا ہو تو لازم ہی کہ اُس مصیبت کو اختیار کریں۔ جو آسان تر ہو۔

بَعْضُ الشَّرِّ اَهْوَنُ مِنْ بَعْضٍ

"بعض مصیبت دوسری مصیبت سے ہلکی ہوتی ہی" نفع نقصان اکثر توام ہوتے ہیں۔ اِس دُنیا میں

نہ غیر مخلوط بھلائی ہے نہ غیر مخلوط بُرائی ہے ہم کو ہمیشہ نفع نقصان کا توازن کرکے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ آیا نفع کا پلہ بھاری ہے یا نقصان کا۔ چنانچہ اندازہ کی بہترین جانچ یہی ہوا کرتی ہے کہ ہم یقین کے ساتھ یہ بات دیکھ لیں کہ بہ نظرِ کل کونسا پلّہ نفع رساں ہے۔ پس اَب ایک پلّہ میں تو ہمکو گُھٹھری ہوئی بالیدگی۔ جسمانی خرابی اور اضاقی بیکاری مع اُس اثر کے جو اولاد پر پڑتا ہے رکھنا ہے اور دوسرے پلّے میں وہ تردّد و فکر رکھنی ہے جو ہمکو اپنی مستورات کی حفاظت و عافیت کی طرف سے دامنگیر ہے۔ اس کے بعد ہم کو یہ سوال کرنا رہ جاتا ہے کہ سب باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے ایسی نسائیت جس کی زندگی میں نسبتاً آزادی ہو خود مختاری اور چستی ہو جس کے ساتھ ساتھ تعلیم ہو تندرستی کی بشاشت ہو زیادہ فایق ہے یا یہ سب اُس امن و قناعت سے جو پردے میں حاصل ہے کمتر ہے۔ اگر ہم کو اس اطمینان ہو کہ پہلی حالت بہتر ہے تو ہمارا پہلا قدم اِسی طرف اُٹھنا چاہیئے کہ پردے کے رواج کی سختی کو ڈھیلا کیا جائے۔

اَب پردے کی رسم کی حالت یہ ہے کہ وہ پُرانا رواج ہے اور ایک زمانۂ دراز سے اُس کا احترام ہوتا چلا آیا ہے۔ کچھ تو اس کی بُنیاد مذہبی عقائد پر ہے اور کچھ تمدنی ضروریات پر ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ پردے سے مذہبی معتقدات کسی قدر ضرور وابستہ ہیں۔ پس اِس مسئلہ کو احتیاط سے ہاتھ میں لینا چاہیئے۔ مبادا کہ کسی کے عقائد کو صدمہ پہونچے۔ جس قدر ترقی اس سمت میں مدنظر ہو وہ رفتہ رفتہ حاصل کرنی چاہیئے پس کسی کا دِل دُکھائے بغیر مَیں بلا خوفِ تردید اس پر زور دونگا کہ ہم کو فوراً اُس پردے کے رواج کی طرف پہلا قدم اُٹھانا چاہیئے جو حجاز میں رائج ہے اور اس پر کسی مذہبی شخص کو اعتراض نہیں ہوسکتا۔ یہ تو حقیقت ہے کہ ہندوستانی خواتین جب حج کو جاتی ہیں تو آزادی سے پھرتی ہیں اگرچہ نقاب پوش ہوتی ہیں۔ اور معمولی زندگی کے ضروری سب کام کرتی ہیں اور درصورتِ ضرورت دُکانوں سے خرید فروخت بھی کرتی ہیں۔ پس جب یہ خواتین حج سے واپس آتی ہیں تو وہی طریقہ کیوں نہیں اختیار کرتیں جو حجاز میں اختیار کیا تھا۔

پہلی تدبیر کے طور پر یہ طریقہ ایسا ہے کہ مطلق قابلِ اعتراض نہیں اور اس سے یقیناً بہت سے نقصان کا تدارک ہوجائے گا جو سردست موجود ہیں۔ میں پکے دینداروں کو جوش دلانا نہیں چاہتا کہ ابھی سے یہ دشوار سوال پیش کردوں کہ پھر اس کے بعد کیا طریق اختیار کرنا ہوگا اور اُس کا کب وقت ہوگا۔ مَیں خیال کرتا ہوں کہ اُس کا انحصار پہلے تجربہ کی کامیابی پر ہے۔ اس کی بابت نفع نقصان کا پہلے تجربہ کر لیا جائے اور یہ تجربہ ہی بتا دے گا کہ آیا ہم کو قدم آگے بڑھانا یا پیچھے ہٹانا چاہیئے۔ اس بحث کو بغیر یہ کہے ہوئے میں ختم نہیں کرسکتا

کہ ہماری جماعت میں ہر ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال نے یہ نفیس مثال دکھادی ہو اور بیگم صاحبہ کی شخصیت ایسی عظیم الشان ہو اور ایسا معیار ہو کہ طبقہ نسواں کس حد تک ترقی کرسکتا ہو۔

مسلم عورتوں کی بیکاری

چونکہ ہماری مستورات پردے کی چاردیواری میں بند ہیں اس لیے اُن کو بیکاری میں زندگی بسر کرنی پڑتی ہی تمامی عملی کاروبار سے وہ اس لیے معطل ہیں کہ باہر کی دُنیا کی اُن کو ہوا نصیب نہیں اور نتیجہ یہ ہو کہ اُن کو کسی پیشہ میں مصروفیت کا موقع نہیں ملتا۔ کوئی شک نہیں کہ انتظام خانہ داری اور بچوں کی تربیت کو ایک سلیقہ اور تعلیم چاہیئے اور اس میں مستورات کا بہت سا وقت صرف ہو جاتا ہی۔ لیکن اگر مستورات کو کافی تعلیم دیجائے اور وقت مناسب طریقہ سے کام میں لایا جائے تو گھر کی بیوی اپنے گھر کو نہایت خوشنما بنا اور کنبہ کی مسرت کو بڑھا اور ضروری آسائشوں میں اضافہ کرسکتی ہی۔ لیکن بہت سے گھر ہیں جہاں ناخواندہ اور غیر تعلیم یافتہ عورتیں ہیں گھر کے حسن انتظام کی طرف کافی توجہ نہیں کی جاتی اور خالی وقت کاہلی اور بیکاری میں گنوا دیا جاتا ہی کیونکہ اِن مستورات کو یہی معلوم نہیں کہ وہ کریں تو آخر کیا کریں گھر کا انتظام عورتوں کے خاص دائرہ عمل میں ہو اور اگر اُن کو کافی تربیت ہو تو کنبہ کی بہبود میں وہ بہت کچھ ترقی دے سکتی ہیں۔ عورتوں کو خاندان کی آمدنی میں مدد دینی چاہیئے غیر ضروری اخراجات بند کرنے چاہیئیں۔ اور یہ خرچ عورتوں کی اپنی محنت سے بچ سکتے ہیں۔ مستورات کو خانگی کفایت شعاری کا علم سکھانا چاہیئے۔ عورتوں کا خالی وقت موزے وغیرہ بُننے۔ سینے اور سُوت کاتنے میں صرف ہونا چاہیئے نیچے درجہ کی عورتیں خوب چرخہ کاتیں۔ اور یہ قدرتی ہو کہ تعلیم یافتہ بیویاں عمدہ دلچسپ کتابیں پڑھیں اور یہ ایسی کتابیں ہوں جن میں تعلیم دینے کا مواد موجود ہو۔ مناسب درجوں کی عورتیں خانگی صنعت و حرفت۔ ہاتھ سے چلانے کی کلوں سے جو خاموشی سے گھروں کے اندر چلائی جاسکتی ہیں کافی کام پاسکتی ہیں میں یہاں پر اُن بیویوں کا حوالہ نہیں دے رہا ہوں جو بہت ترقی کرچکی ہیں۔ جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرچکی ہیں اور جن کے واسطے تعلیم دینے اور طبی صیغہ کی خدمات کھلی ہوئی ہیں۔ لیکن عمومیت کے ساتھ میں مسلم عورتوں کا ذکر کر رہا ہوں کہ اُن کا بیکار رہنا بھی ہمارے اضافی افلاس کا ایک سبب ہی کیونکہ آبادی کا آدھا حصہ ایسا موجود ہی جو حصولِ معاش میں حصہ نہیں لیتا۔ ہم کو لازم ہی کہ اپنی عورتوں کو مفید اور جفاکش بنائیں اور وہ خاندان کی آمدنی میں اضافہ کریں اور اس سے مصیبت کے بار کو گھٹائیں۔

غیر صحیح اشتراکی خاندان[۱۳۱]

اپنے ہندو برادران کے نہایت قریب ہمسایہ ہونے کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہم نے ساجھی یا اشتراکی خاندان کا طریقہ جزوی طریقہ سے اختیار کر لیا ہے۔ ہمارا قانون وراثت ہندوؤں کے قانونِ وراثت سے بالکل مختلف ہے۔ جائداد میں شرکتِ ملکیت جس میں حقِ عودی موجود ہو ہمارے یہاں نہیں ہے پس ہندوؤں کے نظام عمل اور اُن کے فوائد جن سے خاندانی جائداد یکجا محفوظ رہتی ہے ہم کو حاصل نہیں ہیں۔ بلکہ ہم کو یہ نقصان ہے کہ خاندان کے نوجوان اراکین اُنھیں خاندان کے اراکین کے دست نگر ہوتے ہیں جن کی آمدنی ہوتی ہے اور جو کچھ کماتے ہیں۔ بہت سے قریبی رشتہ دار نہ صرف بھائی بلکہ چچا۔ ماموں، چچیرا اور ماموں زاد بھائی اور دوسرے رشتہ دار ایک خاندان کی طرح اکٹھا رہتے ہیں اور کفایت اور پرورش کے لئے خاندان کے ایک یا دو ایک اراکین پر جو روٹی کماتے ہیں بھروسہ کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھروسہ کرنے والے بھی اکثر مدد اور امداد کرتے ہیں لیکن آمدنی میں اُن کا کوئی قانونی حق نہیں ہوتا جیسا کہ ہمسایہ ہندوؤں کا ہوتا ہے۔ پس تمام عمر کے واسطے یہ لوگ دست نگر رہتے ہیں اور سوائے بیکاری اور کاہلی کے اس طریقے سے کسی اور بات کی ہمت افزائی نہیں ہوتی۔ کیسا اچھا ہوتا اگر یہ نوجوان متوسّل اور قریبی رشتہ دار خودمختار ہوتے اور اپنی کمائی پر بھروسہ کرتے۔ اگر وہ کسی تجارتی کاروبار میں شریک بنائے جاتے تو اپنی محنت کے صلے میں اُن کو معقول نفع ملتا چونکہ اس قسم کا کوئی معقول مشغلہ یا دلچسپی موجود نہیں ہے متوسلین کا یہ طبقہ جس کو کوئی خاص کام نہیں ہے بالکل کاہل اور نکمّا ہو گیا ہے۔ ان لوگوں کو وقت کی مطلق قیمت نہیں کیونکہ وہ گھروں پر بیکار بیٹھے ہوئے ہیں۔

دُنیا میں تہذیب و شائستگی کے انقلاب و زوال ہو چکے ہیں۔ ایسے زوالوں کے اسباب تاریخ کا مطالعہ کرنے والا دریافت کر سکتا ہے۔ ابتدا یوں ہوتی ہے کہ قوم کی تمدّنی عادات و حالات میں تبدیلی شروع ہوتی ہے۔ اور جہاں ایک دفعہ بیکاری، سُستی اور کاہلی کی طرف رجعت ہوئی یا عیش و عشرت اور تن آسانی میں حد سے زیادتی عمل میں لائی گئی۔ بس وہاں افراد ہی بدتر نہیں ہو جاتے بلکہ تمام کا تمام آوا بگڑ کر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قوم اپنے اعلیٰ صفات کے اعتبار سے ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔

ہماری یہ عادت ہونی چاہیئے کہ ہم ہر لحظہ اپنے دل سے یہ سوال کرتے رہیں۔ کیا ہم بیکار ہیں؟ کیا ہم اپنی اچھی تندرستی اور مضبوط مزاج کو قایم رکھ کر اپنی آمدنی بڑھانے کو زیادہ کام کر رہے ہیں؟ کیا ہم سب باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے خرچ سے زیادہ کما رہے ہیں؟ کیا ہم پس انداز کرتے ہیں اور کسی آڑے وقت کے واسطے

ہم نے کچھ جمع کیا ہی؟ کیا ہم نے اپنے بچّوں کی پرورش اور تعلیم کا کچھ سامان کر لیا ہی؟ یا اگر ہم اچانک مر جائیں یا کسی سبب سے ناقابل ہو جائیں تو پسماندگان کا انتظام پرورش کیا ہی؟ کیا ہم نے اُس وقت کے واسطے کچھ سرمایہ بہم پہونچا لیا ہی جبکہ ہم بوڑھے ہو کر کام کرنے کے لایق نہ رہیں گے یا ہم بیمار ہو جائیں گے یا ایسی ہی قسم کے اور وجوہ پیش آ جائیں گے؟ کیا جہاں تک ممکن ہی اور ہم میں قابلیت ہی اُس حد تک ہم اپنے خاندان کے لیئے مفید ہیں اسی طرح اپنی جماعت اور اپنے ملک کے واسطے کیا ہم کارآمد ہیں۔ اگر ان سوالوں کا جواب ہم اثبات میں دے سکیں تو ہم کو یقین ہونا چاہیئے کہ ہم ایماندارانہ۔ باقاعدہ۔ اور مفید زندگی بسر کر رہے ہیں اور پورا پورا اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔

کلب کی زندگی

کلب کی زندگی کو ابھی ہندوستان میں ہم نے ترقی نہیں دی ہی جس کا مغربی شایستگی نے ارتقا کیا ہی دوسرے شایستہ ممالک میں کلب موجود ہیں کلب کے ارکان جمع ہو کر تبادلۂ خیالات کرتے اور تمدّنی مساوات کے ساتھ ملتے ہیں۔ ایسی افادہ گاہیں تمام دِن کی شدید محنت کے بعد ذرا دل بہلانے اور سستانے کا موقع دیتی اور زندگی کو بشاش بناتی ہیں۔ اگر کلب۔ انجمنیں اور مطالعہ کے کتب خانے قایم ہو سکیں اور اُن کی تعداد زیادہ ہو تو شام کو اپنے بچے ہوئے وقت میں لوگوں کو معلوم ہو کہ وہ کیا کریں عورتوں کے لیے باہم ملنے جُلنے کی آسانیاں تو اس سے بھی زیادہ کم ہیں۔ اور چند ہی ایسے مقام ہیں جہاں خواتین کے پردہ کلب قایم ہیں۔ اس بات کے جاننے سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہی کہ دوسری خواتین لباس کس طریقہ کا پہنتی ہیں گفتگو کس طرح کرتی ہیں ملنے جُلنے کی وضع کیا ہی۔ لیکن اس طرح کی تعلیم جو بہتر تعلیم کہلاتی ہی اور براہِ راست وہ نہیں دی جایا کرتی ہی ہماری خواتین کے واسطے ممنوع ہو گئی ہی کیونکہ باہم ملنے جُلنے کا اون کو موقع نہیں ملتا

تفریح

کیسے افسوس کا مقام ہی کہ ہمارے متوسط اور نیچے درجے کے واسطے سیر و تفریح کا جو کچھ رستہ کھلا ہوا ہی وہ بس اسی قدر ہی کہ شہر اور بازاروں کی دُھوئیں سے اَٹی ہوئی گرد آلود سڑکوں پر شام کو پیدل پھریں گھر سے باہر کی ورزش اور کھُلی ہَوا کے کھیل رمنوں اور سبزہ زاروں اور دوسرے عام مقاموں میں اُن کو میّسر نہیں اگر لوگوں کے دِلوں پر یہ بات نقش کی جائے کہ پھیپھڑوں کو تندرست حالت میں رکھنے کے لیئے تازہ اور صاف ہَوا کثرت سے مہیا کرنے کی کس قدر ضرورت ہی تو ہماری عادتوں میں بہت کچھ ترقی ہو سکتی ہی۔ ہندوستان میں

ایسے مہلک امراض سے جیسے سل اور دمہ میں کثرت سے اموات ہوتی ہیں۔ اور بہت تھوڑے ایسے لوگ ہیں جن کو یہ اصلیت معلوم ہی کہ وہ جو مہلک بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہی کہ جسم کی مناسب پرورش کے واسطے اُن کو ضروری کافی تازہ ہوا میسر نہیں آتی۔

جسمانی صفائی

مذہب اسلام سے بڑھکر کسی نے بھی جسمانی صفائی کی تاکید نہیں کی ہی یعنی خاص حالتوں میں غسل واجب کر دیا ہی اور پانچ دفعہ روزانہ وضو کا حکم دیا ہی۔ اچھی تندرستی کا جسمانی صفائی ایک جزو ہی۔ ایک غریب آدمی کے پھٹے اور پیوند لگے ہوئے کپڑے اگر صاف ہوں تو آنکھوں کو کبھی بُرے نہیں معلوم ہوتے نفرت پیدا کرنے کے بجائے وہ ہمدردی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن میلے چہرے۔ ہاتھوں اور کپڑوں سے گھن پیدا ہوتی ہی اور پتہ چلتا ہی کہ یہ شخص عادت کا گھنونا اور ادنے خیال کا ہی اچھی تربیت سے ہمیشہ صفائی کی عادت پیدا ہوتی ہی۔ چنانچہ ابتدائی تربیت کی حالت ہی میں بچوں کو صفائی کی عادت سکھانی چاہیئے۔ اگر بچے بچپن ہی سے صفائی کے عادی کر دیئے جائیں تو رفتہ رفتہ اُن میں احساس تیز ہو جائے گا اور میل اور گھنون پن سے اُن کو نفرت ہو جائے گی۔ یہ تاسف کا مقام ہی کہ متوسط اور نیچے درجوں میں صابون کا استعمال ابھی عام نہیں ہوا ہی اور صابون کی وہ قدر نہیں جانتے۔ صابون کے استعمال سے صرف یہی نہیں ہوتا کہ چہرا صاف اور اُجلا ہو جاتا ہی۔ نہیں صابون تو مسام دار چمڑے سے میل کو دور کر دیتا ہی اور پھر جسم سے خوب قدرتی پسینہ کے ذریعہ سے بخارات خارج ہوتے ہیں۔ میری خواہش ہی کہ پرائمری مدارس میں صابون کا استعمال اس طرح لازمی کر دیا جائے جس طرح الہ آباد کے مجیدیہ اسلامیہ اسکول میں لازمی کر دیا گیا ہی۔ اس مدرسہ میں ہر صبح کو صابون۔ گاڑھے کی تولیاں اور کثرت سے پانی مُفت دیا جاتا ہی اور ہر لڑکے کو یہ تاکید ہی کہ اگر پاؤں نہیں تو ہاتھ مُنہ اچھی طرح دُھو کر درجہ میں سبق پڑھنے کو آئے۔ اس طرح اُمید کی جاتی ہی کہ بچپن ہی میں لڑکوں کے درمیان نئی عادتیں پیدا ہو کر پھر اُن کے گھروں میں بھی اِن عادتوں کا رواج ہو جائے گا۔

باب دوم

تمدنی رسوم نے ہماری اخلاقی زندگی پر اثر ڈالا ہی

مُسکرات اور منشیات سے اجتناب

اسلام ہی صرف ایسا مذہب ہی جس نے مے نوشی کی تمدنی بلا کی پورے اثر کے ساتھ گرفت کی ہی جمعیت کا

یہ حال ہے کہ اصطباغ اور عشائے ربانی کا مسئلہ وہاں موجود ہے اور اس سے شراب نوشی کی اگرچہ واقعی تحریک تو نہیں ہوتی تاہم کم سے کم اس نے شراب خواری کو ممنوع قرار نہیں دیا۔ پس تمامی دُنیا کے مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے شراب خواری پر پُر زور الفاظ میں لعنت بھیجی اور اُس کو قطعی حرام قرار دیا۔

قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں "یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْھِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُھُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا (تجھ سے پوچھتے ہیں حکم شراب کا اور جوے کا تو کہہ ان میں گناہ بڑا ہے اور فائدے بھی ہیں لوگوں کو اور ان کا گناہ فائدہ سے بڑا ہے" (سورہ البقر رکوع ۲۷)

صدیوں حد سے متجاوز مے نوشی کرنے کے بعد مغربی تہذیب نے مے نوشی کی خرابیوں کی اصلیت اب محسوس کرنی شروع کی ہے۔ بیشک امریکا نے پیش قدمی کی ہے اور اپنے قصد سے کہ "خشک امریکا" پیدا کرے اُس نے دُنیا کے سامنے اس معاملہ میں اسلامی تقلید کی نظیر پیش کی ہے اور ٹمپرنس (پرہیز و اعتدال) کی تحریک میں نئی حرکت دی ہے۔ ۱۹۲۰ء سے جبکہ مے نوشی کی ممانعت پہلی دفعہ عمل میں آئی ہے اُس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ حیرت خیز کثیر سرمایہ جمع ہو گیا ہے۔ مزدوری پیشہ لوگوں کی حالت میں بڑی ترقی ہوئی ہے۔ خانگی زندگی بہتر ہو گئی ہے۔ تمدنی رشتے اور تعلقات خوشگوار ہو گئے ہیں اور جرائم میں نمایاں کمی ہو گئی ہے۔ اس موقعہ پر پریسیڈنٹ ہارڈنگ کے الفاظ کا اعادہ بہتر ہوگا "ہر ایک جماعت کے مردوں اور عورتوں کو اب یہ جاننے کا موقعہ ملا ہے کہ ممانعت کے کیا معنی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اب قرضے فوراً ادا ہو جاتے ہیں اور اپنی محنت مزدوری کا پیسہ جو پہلے اوباش خانوں میں برباد ہوتا تھا لوگ اپنے گھروں میں لاتے ہیں۔ خاندانوں کا لباس اور کھانا بہتر ہو گیا ہے۔ اور سیونگ بنک میں زیادہ روپیہ جمع ہو رہا ہے"

ہمارے سامنے یہ مسئلہ زیادہ آسان ہے چونکہ امریکا میں ممانعت سے پہلے آبادی کا بہت بڑا حصہ شدت سے مے نوش تھا ہمارے ملک میں فی صدی معدودے چند شراب پیتے ہیں۔ جبکہ عشائے ربانی اور اصطباغ نے مسیحی مذہب میں شراب چکھنے کی اجازت دی ہے۔ اسلام نے اُس کو قطعی حرام کیا ہے۔ اور ہندو مت بھی اُس کو بُرا سمجھتا ہے۔ امریکہ میں اکثر خود غرضی کی بنا پر پرہیز و اعتدال کی تحریک کے خلاف بڑی بے رحمی سے جنگ کی گئی۔ ہندوستان میں عام رائے مے نوشی کے خلاف ہے۔ اور آخر میں یہ ہے کہ امریکا کے لوگ نہایت ہی دولتمند ہیں جب کہ ہندوستان کی آبادی کا بہت بڑا حصہ نہایت ہی نادار ہے اور قریب قریب ایسا فاقہ زدہ ہے کہ امریکا کے آدمی سے اُس کی آمدنی بیسواں حصہ بھی نہیں۔ اگر متحدہ عام رائے ممانعت کی پشتی پر

ہوجائے اور ہر مجلس سے احتجاج کی صدا بلند ہو تو یقینی ہی کہ گورنمنٹ مان جائے گی اور امریکہ کی عمدہ مثال کی تقلید کرے گی۔ جو دولت کے اعتبار سے نہایت مالدار ہی اور رقبہ میں کم ہی اور ہندوستان سے اُس کی آبادی کم اور آب و ہوا کے اعتبار سے زیادہ معتدل ہی اور جہاں اعتدال و پرہیز کی ہمارے ملک جیسی ضرورت نہ تھی وہ افرادی معاملات نہیں ہیں جن پر ہم کو غور کرنا ہی یا جن کی ہم کو مذمت کرنی ہی بلکہ وہ تمام قوم کی مصیبت ہی جو مے نوشی کے اثر سے پیدا ہوئی ہی اور یہ نظارہ نہایت تاسف خیز اور جگر شگاف ہی یہاں ایک نظیر موجود ہی جہاں یورپ کو مغربی ایشیا سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ تیرہ سو پچاس برس ہوئے کہ اسلام نے مے نوشی کو حرام قرار دیا تھا اور اسلامی ممالک کو دیکھ لو جہاں اعتدال اور شراب سے اجتناب کا عام دستور ہی اور شراب کا استعمال شاذ پایا جائے گا۔ لیکن اب باہر کی دُنیا پر نظر ڈالیئے تو وہاں ترقی کی ابھی پہلی ہی منزل ہی پس ہمارا بڑا فرض ہی کہ اپنے پرہیز اور روشن مثال سے دُنیا کو اپنا فخر زندہ کرکے دکھا دیں کہ دیکھو کس طرح اسلامی پوری جماعت جو تمامی دُنیا کی آبادی کا دسواں حصّہ ہی شراب سے یوں پرہیز کرسکتی ہی۔ کامیابی کا صرف یہی ایک طریقہ معلوم ہوتا ہی کہ شراب نوشی کے خلاف عام رائے بیدار کیجائے۔ اور میخواروں کا میل جول بطور سزا کے روک دیا جائے یہ بُری عادت جب متوسطین اور مزدوری پیشہ لوگوں میں پیوست ہوجاتی ہی تو پوری جماعت کے واسطے وہ ایک عذاب ہوجاتی ہی اور اولاد کی خوشحالی پر بڑا ہی منحوس اثر ڈالتی ہی غریبوں کی مزدوری جو خود اُن کی اور اُن کے بال بچوں کی پرورش میں صرف ہوتی شراب کی نذر ہوجاتی ہی۔ پھر شراب کی ہوس پیدا ہوکر مے نوش کی تندرستی پر بُرا اثر پڑتا ہی اور تمامی خاندان پر مصیبت نازل ہوجاتی ہی۔ پس ہم کو نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ اسلامی تعلیم پر عمل کرنا اور اپنے رسول علیہ السلام کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے تاکہ مصائب کے غاروں میں گرنے سے ہم محفوظ رہیں اور یہ وہ غار ہوتے ہیں جو مے نوشی کی عادت مے نوش کے واسطے پہلے سے تیار رکھتے ہیں۔

قمار بازی

قمار بازی کا وہی درجہ ہی جو مے نوشی کا اور قرآنی آیتہ دونوں کے خلاف ایک ہی قمار بازی کے بُرے اثر ایسے عام شاید نہیں ہیں اور اسی واسطے اُس کے خلاف اس قدر شور و غل نہیں۔ دیوالی کے دنوں میں بڑا لالچ دامنگیر ہوتا ہی لیکن تھوڑا بہت جُوا تو تمام سال برابر جاری رہتا ہی۔ ہم اُس اصلاح کا انتظار کررہے ہیں جو عام جوئے کے خلاف ہماری ہولناک جماعت آغاز کرنے کو ہی۔ یہ جوا عام سڑکوں اور عام مقامات پر

اجازت سے دیوالی جیسے موقعوں پر کھیلا جاتا ہی اور ہر جماعت کے بھولے بھٹکے کو جوئے کی افسوسناک ترغیب ہوتی ہی۔ مگر مغربی ممالک میں تو قماربازی نے مزمن بیماری جیسی شکل پکڑ لی ہی۔ طرح طرح کے قوانین اُس کو روکنے اور قابو میں لانے کو وضع کیئے جاتے ہیں۔ اب لوگوں کو یہ اصلیت معلوم ہونی شروع ہوئی ہی کہ یہ فطرتاً کل جوا کھیلنا کسی ایک شخص کے لیئے بھی مفید نہیں ہی۔ اتفاق اور اوسط کے اعتبار سے آخر کو نفع میں وہ شخص رہتا ہی جو "نال" لیتا ہی۔ رہے کھیلنے والے خود۔ تو قماربازی صرف ایک تجویز و تدبیر ہی کہ روپیہ ایک کے ہاتھ سے دوسرے کے ہاتھ میں منتقل ہوتا ہی لیکن نتیجہ دونوں کے حق میں نہایت بُرا نکلتا ہی یعنی جیتنے والے کی تو اسراف کی عادت پڑ جاتی ہی اور ہارنے والا مصائب میں مبتلا ہو جاتا ہی۔ خوش قسمتی سے ہندوستان میں قماربازی کے خلاف قانون موجود ہی جس سے یہ سعی کیجاتی ہی کہ عام قمارخانے رکھنے والے اور عام مقامات پر جوا کھیلنا روک دیا جائے لیکن ہنوز قانون کافی سخت نہیں ہی کہ جوئے کی بلا کو قطعی مسدود کر دے۔ یہ اُمید کی جاتی ہی جوں جوں رائے عامہ زیادہ قوی ہوتی جائے گی اور زیادہ سخت قیود کا نفاذ ہو جائے گا۔

ہندوستانی مسکرات

کشید کی ہوئی شرابوں کا تو مسلمانوں میں بہت عام استعمال نہیں ہی۔ لیکن ہندوستانی نشہ آور چیزیں جیسے گانجا۔ افیون اور پچھلے سالوں سے کوکین کی استعمال میں جو شراب ہی کی طرح مضر ہیں ہندوستان کے مسلمان کمزوری ظاہر کر رہے ہیں۔ ان نشہ آور چیزوں سے استعمال کرنے والے لوگوں پر نہایت ہی مخرب اخلاق اثر پڑتا ہی صحت تباہ اور پراگندہ ہو جاتی ہی۔ اس کے عادی کسی سخت محنت یا لگاتار کام کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ یہ عادت جماعت کی قوت چوس رہی ہی اور اُس کی تندرستی کی بنیاد اندر ہی اندر سے خالی کیئے دیتی ہی۔ بین الاقوامی لیگ اس عام مصیبت کی طرف اپنی بڑی توجہ مبذول کر رہی ہی اور اُمید کیجاتی ہی کہ ہندوستانی بھی اس کمینی عادت کی بُرائی کے بدنتائج اور تندرستی پر اُس کے مضر اثرات کی اصلیت کو سمجھینگے اور اس آفت کا قطعی استیصال کر دیں گے۔

اَور بھی بےشمار دوسری چیزیں ہیں جو ہماری اخلاقی زندگی پر بالواسطہ اثر کرتی ہیں اور یہ اثر نوجوانوں پر ہو رہا ہی لیکن اگر اُس نقصان و ضرر کا جو اِن چیزوں سے ہو رہا ہی مناسب اندازہ کر لیا جائے گا تو وہ آسانی سے دفع کر دی جاسکیں گی۔

۳۔ گندہ فحش لٹریچر

ارزاں اور ادنیٰ ذلیل قسم کے ناولوں اور ڈراموں کی فہرست سے بے شبہ بڑا ضرر پہونچ رہا ہے۔ اِن کا منشا صرف اسی قدر ہے کہ انسان کے جذبات رذیلہ کو تحریک دی جائے۔ ایسے مصنفین جن کو پختہ تربیت و تعلیم ہوئی ہے ایسی کتابیں لکھ سکتے ہیں جن سے علم ادب مالامال ہو جائے اور انسان کے بہترین محسوسات سے اپیل ہو۔ لیکن یہ دو کوڑی کے مصنف جن کی نظر تنگ ہے اور جن کا صرف یہی مقصود ہے کہ اُن کی ذلیل کتابوں کی بکری ہو بس جماعت کے ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے پڑھنے والوں پر نظر رکھتے ہیں۔ اور یہ انھیں لوگوں کی طرح کتابیں لکھتے ہیں جن کا پیشہ جذبات کو اُبھارنا ہے۔ وہ اپنی کتابوں کی خوبی سے بازار کو قابو میں لانا نہیں چاہتے بلکہ اپنی کتابوں کے شوخ گندے بیان سے جو مرد اور عورت کے اندر بدترین ہیں اپنی کتابوں کی نکاسی کی اُمید کرتے ہیں۔ کیونکہ ایسے مضامین پر محض غیرت و حیا کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کے اہل قلم اپنا قلم نہیں اٹھاتے اس کی وجہ یہ ہے کہ اِن انشا پردازوں کو بہتر مذاق عطا ہوا ہے اور تہذیب و متانت کو وہ پوری طرح ملحوظ رکھنے والے ہیں۔ نوجوانوں کی طبائع پر ایسی عمر میں جبکہ وہ زود اثر پذیر ہوتی ہیں اور خود طبایع میں ایک ولولہ ہوتا ہے ان مخرب اخلاق کتابوں کا جیسا ضرر رساں اثر پڑا ہے اُس کا اندازہ محال ہے۔ چنانچہ یہ گندہ لٹریچر اُن علمی کتابوں سے جو محض تعلیم و تربیت کی غرض سے لکھی جاتی ہیں قطعی جُدا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی ذمہ داری تمام جماعت پر عائد ہوتی ہے۔ جب تک اِن کتابوں کی مانگ رہے گی وہ برابر مہیا کی جائینگی اور کچھ پروانہ کی جائے گی کہ چند منتخب افراد کے اخلاقی احساس کو صدمہ پہونچتا ہے یا نہیں۔ ایسے گندے لٹریچر کا اگر احتساب کیا جائے تو کام نہ چلے گا کیونکہ احتساب کی کافی رسائی نہیں ہو سکتی بلکہ علاج یہ ہے کہ تمامی جماعت کی طرف سے اصرار کے ساتھ ایک ایسی منتظم کوشش کی جائے کہ اس گندے لٹریچر کی طرف مطلق توجہ نہ ہو اور وہ حقارت کی نظر سے دیکھا جائے۔ اور جیسے ہی کہ اُس کا بازار سرد ہوگا یہ گندہ لٹریچر خود بخود بند ہو جائے گا کیونکہ اُس کی وَبا تو صرف مالی فائدہ کی غرض سے آئی ہوئی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ یقینی قدرتی طریقہ یہ ہے کہ گورنمنٹ اس معاملہ میں مداخلت کرے اور بڑے پیمانہ پر مجرموں کو سزا دے اور ضرر کا دروازہ فوراً بند ہو جائے گا۔

بہت سے ایسے رسالوں کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے جو اوپر کہا گیا جو بغیر انتخاب مناسب عشق و محبت کی کہانیاں شایع کرتے اور کہانیوں میں گہری دلچسپی قایم رکھنے کو کہ ان کی ہمیشہ سرپرستی ہوتی رہے اِن کہانیوں کو ٹکڑے کر کرکے باقساط چھاپتے ہیں۔ اور اگر یہ ترکیب نہ کی جائے تو بہت تھوڑے لوگ خریدار ہوں

بہت سے روزانہ اور ہفتہ وار اخبار اس جستجو میں رہتے ہیں کہ کچھ ایسا مواد ہاتھ آئے جس سے جذبات کو ہیجان ہو اور ان اخباروں کی فروخت ہو اور بعض کو تو اس سے بیحد مسرّت ہوتی ہے کہ قتل۔ ڈکیتی زنا بجبر لوٹ مار۔ بچوں اور عورتوں کا سرقہ کرکے بھگالے جانا اور اسی قسم کے جرایم کی پوری تفصیلیں شایع کریں اور اسی قدر نہیں بلکہ وہ بڑی شرح وبسط کے ساتھ قسم قسم کی تجویزیں جن کو چور۔ جعل ساز۔ دغا شعار ایجاد کرتے ہیں اور دوسرے خراب قسم کے مقدمات کی مفصل رپورٹیں چھاپتے ہیں جن سے جذبات میں ایک جوش وخروش پیدا ہو۔ کیا ہم کبھی اس معاملہ پر غور کرتے ہیں اور یہ خیال کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس طوفان بےتمیزی کے کثیر نشر و اشاعت سے کیسے کیسے ضرر ہو رہے ہیں۔ اور کیا ہم اس کی اصلیت کو محسوس کرتے ہیں کہ یہ اخبار تحریری لکچروں اور مراسلت کے ذریعہ سے جرایم کا علم دوسروں کو پہونچانے کے درسگاہ ہیں۔

مَیں امید کرتا ہوں کہ وہ وقت جلد آرہا ہے کہ مجلس وضع قوانین اس معاملہ میں مداخلت کرے گی اور جرایم پیشہ لوگوں کی سوانح عمریاں یا خاص جرایم اور طلاق کے مقدمات کی تفصیلیں شایع نہ کرنے دیگی پُشتہا پشت سے ایسی رپورٹوں کی اشاعت کی طرف سے عام مذاق بگڑ چکا ہے اور یہ صرف ہندوستان ہی میں نہیں ہے بلکہ قریب قریب تمام دنیا کے شائستہ ممالک کا یہی حال ہے اور اندیشہ ہے کہ سوائے قانون کے اس کا قرار واقعی اور کچھ علاج نہیں ہے۔ ہوس آف لارڈس کی حال کی مثال متعلق اُن رپورٹوں کے جو شادیوں کے متعلق شایع ہوا کرتی ہیں ہمارے پیش نظر ہے۔ ہمیں اُس مثال کو صرف طلاق کے مقدموں پر منطبق ہی نہ کرنا چاہیئے بلکہ اسی قسم کے دوسرے مقدمات تک وسعت دینا چاہیئے۔

تھیئیٹر اور بائسکوپ (سنیما)

اِسی مساوات سے تھیئیٹر و اور اسٹیج پر تماشوں میں تہذیب کو نظر انداز کرنے سے ضرر پہونچ رہا ہے۔ اس میں تو کلام نہیں کہ تماشہ گاہوں میں وہی باتیں جو خانگی زندگی میں گزرا کرتی ہیں دکھانے کا خیال کیا جاتا ہے لیکن اس کی کیا ضرورت ہے کہ عشق محبت کا منظر من وعن دکھایا جائے اور اس کی تو یقیناً ضرورت نہیں ہے کہ عشق و عاشقی کے ایسے پیغام وسلام جن سے سنجیدہ مزاجوں کو گھن۔ نفرت اور صدمہ پہونچے اور نوجوانوں کو غم اندوز سبق ملے تماشہ میں دکھائے جائیں چنانچہ محکمۂ احتساب کو زیادہ ہوشیار ہو جانا چاہیئے اور وہ اپنے تئیں اسی حد تک محدود نہ رکھنا چاہیئے کہ تماشوں کی منظوری دے یا اُن کی ممانعت کرے کیونکہ اس سے مداخلت کو بہت تھوڑی گنجائش

رہ جاتی ہو بلکہ یہ کرنا چاہیئے کہ جہانتک اچھے اور پاکیزہ مذاق کے خلاف کوئی تماشہ کی تقریر۔ پارٹ کرنا یا ناچنا قابلِ اعتراض ہو اُس سب کو روک دے۔

سنیما کے متعلق بھی یہی حالت ہو لیکن احتساب کو سنیما کے متعلق زیادہ دشواری کا سامنا ہو کہ وہ سنیما کے کسی حصہ میں ترمیم یا قطع بُرید نہیں کرسکتا۔ دوسری دشواری یہ ہو کہ زیادہ فلمیں امریکا اور یورپ کے تماشہ دیکھنے والوں کے لیئے تیار کی جاتی ہیں جہاں طفولیت سے یہ تعلیم دی جاتی ہو کہ جو کچھ اچھائی اور نیکی ہو وہ شمال اور مغرب میں ہو اور جو کچھ بدی اور بُرائی ہو وہ جنوب اور مشرق میں ہو۔ پس جب مشرقیوں کی مضحکہ خیز تصویریں بائسکوپ کی چادر پر دکھائی جاتی ہیں تو ہندوستانی تماشہ دیکھنے والوں کو گھن آتی ہو۔ اکثر ایسا کیا جاتا ہو کہ ایک افریقی یا چینی اور کبھی کبھی ہندوستانی تماشہ کے بدمعاش قرار دیکر چادر پر دکھائے جاتے ہیں کہ یہ ہی وہ لوگ ہیں جو وحشیانہ اور ظالمانہ ایسے افعال کے مرتکب ہوسکتے ہیں جو زمانہ ماضی کے وحشیوں سے سرزد ہوا کرتے تھے۔ اصلیت بے حد توڑی مروڑی جاتی ہو اور اس سے یہ مدعا ہوتا ہو کہ کوئی نئی اور جذبات کو اُبھارنے والی بات پیدا ہو۔ چنانچہ حد سے افزوں مبالغے کیئے جاتے ہیں اور یہی وہ کوشش عام ہے کہ جن قوموں کے افراد کا بائسکوپ میں اس طرح مضحکہ کیا جاتا ہو اُن قوموں سے مغرب والوں کی نفرت وحقارت میں ترقی ہو۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ ایسے چھوٹے کینہ توز اور یا جیانہ منظروں سے جو امور واقعی کا بگاڑنا اور خوددار لوگوں کی توہین ہو ہم محفوظ رکھے جائیں گے۔ ہم کو حاجت نہیں ہو کہ اپنے ہمسایہ افریقہ اور مشرقی ایشیا کے لوگوں کی فرضی بدمعاشی اور غیر اصلی رذالت کی غلط تصویر ہم دیکھیں۔

اِس سے اطمینان ہوتا ہو کہ گورنمنٹِ ہند اُس ضرر کی طرف سے قطعی بیدار ہو جو سنیما کی چادر پر جھوٹی اور ناپسندیدہ کہانیوں کے ذریعہ سے دکھائے جانے سے پہونچ رہا ہو اور گورنمنٹ نے ایک مضبوط کمیٹی قائم کردی ہو جو سنیما کی فلموں کے احتساب کے متعلق تحقیقات کر رہی ہو۔

دشنام دہی اور بدزبانی

اس سے زیادہ بے حیائی اور نفرت کی اور کونسی چیز ہوسکتی ہو کہ جھگڑے۔ غصہ اور گفتگو میں دشنام کا استعمال ہو۔ اور بدقسمتی سے ہندوستانی جماعتوں کا ایک بڑا حصہ اس میں مُبتلا ہو۔ بہت ایسا

ایسا ہوتا ہے کہ قسم کی شکل میں غلیظ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں اور مطلق لحاظ نہیں کیا جاتا کہ ان گندے الفاظ میں جو کنائے مضمر ہیں اُن کی پوری اصلیت کیا ہے۔ جماعت میں یہ بُری عادت گویا ایک وبا ہے اور کسی قدر یہ اِس کا نتیجہ ہے کہ مرد اور عورتیں جدا جدا ہیں۔ ہمارا فرض اولین یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنی قومی زبان کو ناپاک جملوں سے پاک کر دیں گے۔ یہ عادت ابتدائی خراب تعلیم کا نتیجہ ہے اور یہ عادت بھی چھوٹ سکتی ہے اگر والدین اس طرف ذرا بھی توجہ کریں کیونکہ بچّوں کو مہذب اور مناسب طریقہ سے تعلیم دینا اُن کا فرض ہے۔

رقص و سرود کے جلسے

رقص کے جلسے ترتیب دینا انتہا درجہ حیا سوز ہے کیونکہ اس کی بدولت بدچلن درجہ کے لوگوں سے صحبت ہوتی ہے۔ اخلاقی پہلو سے جو بُرا اثر پڑتا ہے وہ بہت بُرا ہے کیونکہ چھوٹے بڑے سب ہی ایسے جلسے میں پہلو بہ پہلو بیٹھتے ہیں جس جلسہ کا صرف منشا ہی یہ ہوتا ہے کہ جذبات میں ہیجان ہو۔ ایسے جلسوں میں شرکت کے اندر یہ راز مخفی ہے کہ ایسی بداخلاق زندگی کی طرف رہنمائی ہو۔ جو پیشہ ور ناچنے گانے والے علانیہ بسر کرتے ہیں۔ اور بالواسطہ اسی پیشہ کی طرف جانے کی یہ ایک تحریک ہے۔ اگر اُن لوگوں کا جو اس فن کے اجارہ دار ہیں ناچنا بند کر دیا جائے تو نقصان اور ضرر کو بہت کچھ کم کر دیگا۔

بازاری عورتیں

ایک اور قابل توجہ رواج جس کے ساتھ ابتک اس ملک میں رواداری برتی گئی ہے اور جو کہ دوسرے ممالک کے اخلاقی احساس کو صدمہ پہونچاتا ہے یہ ہے کہ بازاروں اور عام گذرگاہوں میں بالائی منزل کے بالاخانوں اور نمایاں چھجوں پر طوائفوں کو رہنے اور اپنی حُسن نمائی کی اجازت دی گئی ہے۔ فی الواقع ہر مذہب نے سوائے نکاح کی حالت کے مرد اور عورت کے اختلاط کی ممانعت کر دی ہے۔ لیکن زمانۂ حال کی دُنیا میں ہمیشہ ایسی حرکتیں مجرمانہ جرم شمار نہیں ہوتیں۔ اب کسب کی اجازت کا قانون اسی ملک سے مخصوص نہیں ہے مگر بہت سے مغربی ممالک میں اس بداخلاق پیشہ کے عام طور پر جاری رکھنے اور علانیہ آشنائیوں کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ اگرچہ اس ممانعت سے یہ بُرائی موقوف تو نہیں ہوگئی ہے ہاں کسی قدر وہ قابو میں آگئی ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہمارے بازار ان مکروہ منظروں سے صاف کر دیے جائیں اور اس کے واسطے محدود مقامات کی قید لگا دی جائے۔ اِس جانب

بظاہر پہلی کارروائی یہ ہوگی کہ طوائفیں جدا کرکے کسی خاص مقام پر جو اُن کے واسطے مخصوص کر دیا جائے بسادی جائیں۔ عام کوچوں میں اِن کی موجودگی سے یہ ہوتا ہی کہ شرفا اُس طرف خرید و فروخت کو جانا پسند نہیں کرتے۔ موجودہ نظام تمدّن پر ان عورتوں کی یہ نمایش ایک داغ ہی۔ غیر ملک والوں کی نگاہ میں ہم سبک ہوتے ہیں اور ثابت ہوتا ہی کہ اس حیا سوز نمایش سے ہم کسی قدر چشم پوشی کرتے ہیں۔

ایسے رِواج جن سے ہماری اقتصادی زندگی پر اثر پڑتا ہی

سب سوالوں سے زیادہ اہم سوال ربوٰا یا بیاج خوری کا ہی جس کے متعلق یہ خیال کر لیا گیا ہی کہ وہ "سود" کے مسَاوی ہی۔ اس کا جواز خالص مذہبی تصفیہ کا معاملہ ہی۔ اور اس کے متعلق صرف علما ہی ناطق رائے دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس معاملہ سے مسلم جماعت کی اقتصادی بہبود پر اثر پڑ رہا ہی لہٰذا اس مسئلہ پر ہر ایک صورت اور نقطۂ نظر سے بحث اشد ضروری ہی اور یہ دیکھنے کی کوشش ہونی لازم ہی کہ آیا اس دُشواری کا کوئی عملی حل ہی یا نہیں۔ اس میں کسی طرح کے شبہ کے گنجایش نہیں کہ "ربوٰا" کی اسلام میں ممانعت ہی۔ قرآن مجید کے صریح الفاظ یہ موجود ہیں:۔ لا تاکلوا الربوٰا اضعا مُضعفۃً (سورۂ آل عمران رکوع ۱۴) یعنی "نہ کھاؤ ربوٰا دوگنے پر دوگنا"۔ یہ آیت ربوٰا کے معاملہ میں قولِ فیصل ہی۔ اختلاف صرف اُسی حال میں پیدا ہوتا ہی جبکہ یہ جاننے کا قصد کیا جاتا ہی کہ "ربوٰا" کے اصل معنی کیا ہیں۔ یہ تو اچھی طرح معلوم ہی کہ یہ آیۃ آنحضرت پر حضرت کی وفات شریف سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ جبکہ آنحضرت صلعم مرض الموت میں مبتلا تھے۔ چنانچہ صحابہ اور متبعین کو یہ موقع نہ ملا کہ بہ وضاحت تمام حضورِ انور سے ربوٰا کے مفہوم کو دریافت کر لیتے۔ چونکہ آنحضرت صلعم کی طرف سے ربوٰا کی کوئی شرح موجود نہیں ہی تو ظاہر ہی کہ ربوٰا سے وہی مراد ہوگی جو اُس زمانہ میں عرب کے درمیان سمجھی جاتی تھی اور جس کا اُس وقت عرب میں رواج تھا۔ اِس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ سود کی تجارتی وضع جس کا آجکل عام رواج ہی اور بینک میں روپیہ جمع کرنا جو تجارت و صنعت و حرفت کی جان ہیں ایسی باتیں ہیں کہ اُس ابتدائی اسلامی زمانہ میں اِن کا وجود نہ تھا۔ لیکن ہاں بیاج خوری۔ خصوصًا یہود میں موجود تھی اور اس رواج کے ماتحت دُوگنے اور دُوگنے سے دُوگنے سود مرکب کی اجازت تھی۔ چنانچہ سود در سود کے اجتماع سے قرض کر لینے والوں کو ایک مصیبت اور بار کا سامنا تھا۔ اور قرضخواہوں کو جن طریقوں سے

قرضہ وصول کرنے کی اجازت تھی وہ طریقے ایذارساں تھے۔ چنانچہ اب یہ ہمارے فاضل علماء کا کام ہے کہ اس امر کے متعلق فتویٰ صادر فرمائیں کہ از روئے قاعدۂ مماثلت ومطابقت ربوا کے بارے میں قرآن مجید کی ممانعت زمانۂ حال کے تجارتی سود پر کیا اثر اور حکم رکھتی ہے۔ میں ایسی جسارت نہ کرونگا کہ مذہبی معاملہ میں دست اندازی کرکے اپنی ذاتی رائے کا اظہار کروں۔ لیکن بلاشک وشبہ اس قدر حقیقت ضرور ہے کہ بعض علماء نے خاص ضرورت کی حالت میں سود کی بعض شکل کے جواز کا فتویٰ صادر فرمایا ہے اعلیٰ پایہ محدث مولانا شاہ مولوی عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ دہلوی۔ اور مولوی عبدالحی صاحب مغفور فرنگی محلی لکھنوی نے یہ فتاوی دیئے ہیں کہ ہندوستان میں سود لینے کی ممانعت نہیں ہوسکتی۔ دوسرے علمائے نے خاص صورتوں کی اجازت دی ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جمہور علماء کی رائے سود کے عدم جواز ہی کی طرف ہے۔

جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ میں اس مذہبی بحث میں نہ پڑونگا کیونکہ اس سوال کو گہرے خیال اور پُر احتیاط غور کے ساتھ نزاکت سے ہاتھ لگانے کی ضرورت ہے۔ لیکن میں اپنے موجودہ علماء سے یہ درخواست بلاخوف تردید کرسکتا ہوں۔ کہ بعض خاص حالات کا لحاظ فرماتے ہوئے جنھوں نے موجودہ صورتِ حال کو پُرانے زمانہ سے کسی قدر بدل دیا ہے اپنی رائے کا اظہار کریں پہلی بات تو یہ ہے کہ جیسی بیاج (ربوا) لینے کی ممانعت ہے اُسی طرح بیاج دینے کی بھی ممانعت ہے۔ تو کیا ایسے ملک میں سود لینے کی ممانعت ہونی چاہیئے جہاں سود دینے کے متعلق شرع اسلام کا نفاذ نہیں کیا جاسکتا؟ ہاں اگر دونوں صورتوں کی یکساں ممانعت ہوتی تو انصاف کا پلّہ قطعی برابر ہوجاتا اور کچھ دُشواری نہ تھی۔ لیکن غریب مسلمانوں کو تو ضرورت نے مجبور کردیا ہے کہ روپیہ قرض لیں اور سود دیں اور بلاسُود اُن کو قرض مل نہیں سکتا۔ تو کیا یک طرفہ ممانعت انصاف کی بات ہے؟ فیصلہ طلب یہ سوال ہے کہ آیا موجودہ تجارتی سود بعینہٖ "ربوا" ہے یا دونوں کے باہم کچھ مماثلت اور مشابہت ہی موجود ہے اور اُس مماثلت اور مشابہت کو کہاں تک اور سود کی صورتوں میں کن انتہائی حدود تک وسعت دیجاسکتی ہے۔ تیسری بات قابلِ لحاظ یہ ہے کہ ممانعت کا منشا تو یہ ہے کہ جس جنس کو تم پہلے دو اُسی جنس کو زیادہ مقدار کے ساتھ واپسی کے وقت نہ لو۔ یعنی کم سونے کے مقابلہ اور معاوضہ میں زیادہ سونا اور کم چاندی کے بدلے میں زیادہ چاندی کیا ممانعت کا اُسی مساوات سے جب بھی اطلاق ہوگا کہ احتیاط کی

خاطر حیلۂ شرعی سے چارہ جوئی کی جائے اور چاندی کے بدلے میں سونا یا نوٹ لیئے جائیں؟ کیا جواز کی صورت اب بھی پیدا نہ ہوگی اگر سونا۔ چاندی کرنسی نوٹ یا غلہ ایک دوسرے کے قایم مقام بنائے جائیں۔ شفع کے معاملہ میں تو حیَل کی اجازت ہے اور یہ حیلے محض غیر مؤثر خیال نہیں کیئے جاتے جبکہ محض مشابہت اور مماثلت کی وجہ سے تجارتی سود ربوا خیال کیا جاتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ حیلۂ شرعی سے چارہ جوئی نہیں کی جاسکتی؟ ہر دُنیا دار کے دِل میں ایسے ہی سوالات قدرتاً پیدا ہوتے ہیں اور ہم توقع کرتے ہیں کہ ہمارے فاضل علماء موجودہ دُشواریوں پر توجہ فرمائیں گے اور چند دشواریاں قبل اس کے کہ علماء فتوے دینے کا عزم فرمائیں میں یہاں پر بیان کرتا ہوں۔

چونکہ مسلمانوں کو سود لینے کی ممانعت ہے لیکن سود دینے کے خلاف کوئی قید نہیں ہے اس لیئے مسلمان نہایت عظیم خسارہ میں ہیں۔ بیاج خوری کو ہر طریقہ سے بند کر دیجیئے چشم ما روشن۔ لیکن ذرا اِنتظار فرما کر اس پر بھی تو غور فرمائیے کہ ہم بیاج دیتے تو رہیں لیکن لیں نہیں۔ تجارت جاری رکھنے کو سال کے بعض موسموں میں تو روپیہ کی اشد ضرورت پڑتی رہتی ہے اگرچہ دوسرے وقتوں میں بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اگر تجارت جاری رکھنی ہے تو روپیہ قرض لینا قطعی بند نہیں کیا جا سکتا۔ نئے خیالات یہ ہیں کہ سرمایہ بیکار نہ رہنا چاہیئے۔ جو شخص سرمایہ کام میں لگاتا ہے نفع حاصل کرتا ہے سرمایہ کے مختلف استعمال ورمنافع ہیں اور سرمایہ کو کام میں لگانا منفعت بخش ہے۔ روپیہ اب صرف تبادلہ کا ذریعہ نہیں رہا ہے بلکہ اُس کی اپنی ذاتی قیمت موجود ہے اب کوئی ایسا سرمایہ ہاتھ نہیں آسکتا جب تک اُس کے استعمال کا معاوضہ نہ دیا جائے۔ ایسا شخص جو سرمایہ سے خود تجارت نہیں کرتا وہ دوسرے کو روپیہ قرض دیتا ہے اور معاوضہ میں نفع کی توقع کرتا ہے کیونکہ اگر اس سرمایہ کو وہ خود استعمال کرتا تو ضرور نفع حاصل کرتا۔

تجارتی کاروبار میں قرضہ ایک موقعہ کے انتقال کا قایم مقام ہے کہ سرمایہ سے روپیہ پیدا کیا جائے۔ قرضخواہ جو سود لیتا ہے فی نفسہٖ وہ اُس نفع کا ایک حصّہ ہے جو قرض لینے والے نے حاصل کیا ہے جس نے سرمایہ کسی کام یا تجارت میں لگایا تھا۔

غدر (۱۸۵۷ء) سے پہلے "دام دوپٹ" کا عام رواج تھا۔ یہ ہندو قانون کے موافق رواج تھا کہ جس قدر روپیہ قرض دیا جائے اس کے دُو گنے سے معہ سود کے زیادہ نہ لیا جائے۔ برار۔ سندھ اور احاطۂ کلکتہ بمبئی میں اب بھی یہ رواج ہے لیکن وہ ہندو قرضداروں تک محدود ہے۔ مقامی طریقہ سے وہ قوانین

اجمیر کے ضابطہ میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ "دم دوپٹ" کے ہوتے ہوئے قدیم زمانہ کے ہندوستان میں بیاج کی انتہائی شرح کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ پس کوئی دُشواری یا ضرر نہ تھا لیکن انگلستان چونکہ انتہا درجہ کی صنعت و حرفت کا ملک ہے اور جہاں کے حالات مادّی طریقہ سے ہم سے مختلف ہیں وہاں سود کی کوئی معین شرح نہ رہی بلکہ منسوخ کر دی گئی اور انگلستان کی گورنمنٹ نے سود کے ایکٹ ۸ ہ ۱۸۵۵ء میں یہ منظور کر دیا کہ فریقین میں جس شرح سود پر معاہدہ ہو جائے چاہے وہ شرح کیسی ہی سنگین کیوں نہ ہو بس وہی قانونی شرح تسلیم کی جائے گی۔ بس یہی بنا ہوئی کہ ہندوستان میں بھی شرح سود کی کوئی قید نہ رہی اقتصادی حالت سے جب انگلستان کا ہندوستان سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو یکساں قانون کے نفاذ سے ہندوستان پر قطعی اُلٹا اثر پڑ گیا۔ انگلستان میں تو شرح سود بہت گھٹ گئی لیکن ہندوستان میں شرح سود بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اگرچہ سود کی وصولیابی کے متعلق ضابطہ میں بہت اصلاح ہوئی ہے اور غدر سے پہلے کے زمانہ کے مقابلہ میں اب زیادہ آسانیاں بھی ہیں اور اب عام امن اور انتظام حکومت میں پائداری موجود ہے پھر بھی نتیجہ یہی نکلا کہ شرح سود بڑھ گئی۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ شرح سود میں کمی کی طرف میلان ہوتا۔ اِس طرح سے زمینداروں اور کاشتکاروں کو جو نقصان پہونچ رہا ہے وہ صرف مُسلم جماعت ہی تک محدود نہیں ہے۔ اگرچہ مسلم جماعت کو نسبتاً زیادہ صدمہ پہونچا ہے۔ پچھلی مردم شماری کی رو سے آبادی کی نسبت یہ ہے کہ ۶۸ ہندو ۲۲ مسلمان اور ۱۰ فی صدی دوسری چھوٹی جماعتوں کے لوگ ہیں۔ پس سخت ناروائی سود کا اثر غریب زراعت پیشہ لوگوں پر بہت زیادہ پڑا۔ ان میں ہندو کاشتکاروں کی غالب جماعت ہے اور اُن کی جائدادیں اُن سے الگ ہو گئیں۔ دفعہ ۱۶ قانونِ معاہدۂ ہند بھی جس میں اس نامناسب اثر کا حوالہ ہے جہاں تک شرح سود کا تعلق ہے۔ کارگر ثابت نہ ہوئی۔ نہ دفعہ ۷۴ نے جو ناروائیوں کے خلاف ہے کافی اثر کیا۔ پچاس برس کے تلخ تجربہ کے بعد آخر گورنمنٹ نے یہ محسوس کیا کہ ناروائی شرحِ سود کی وجہ سے تجارت و حرفت پر مہلک اثر پڑ گیا ہے اور ملک کی ترقی رُک گئی ہے۔ چنانچہ ناروائی شرح سود کے قرضوں کے ایکٹ ۱۰ ۱۹۱۸ء میں اَب عدالتوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ جہاں اُن کی رائے میں معاملہ میں حد سے زیادہ سختی عمل میں آ رہی ہو وہاں وہ مداخلت کریں اور تعداد سود کو گھٹا دیں۔ توقع ہوتی ہے کہ اگر عقل و فراست کے ساتھ تجویز میں کام لیا گیا تو اِس جدید قانون کا مفید اثر ہوگا۔ روپیہ قرض دینے والوں کی حرص میں کمی ہو جائے گی اور آخر میں

شرح سود ایک مناسب حد پر آجائے گی جیسی دوسرے ترقی یافتہ شائستہ ملکوں میں حالت ہے۔ روپیہ قرض دینا آمدنی کا مفید ذریعہ ہے جس میں نہ محنت کی ضرورت ہے نہ کوشش کی۔ روپیہ اس بیوپار سے بڑھتا اور ایسی تیزی سے زیادہ ہوتا جاتا ہے کہ کسی اور پیشہ یا کاروبار سے ہونا ممکن نہیں۔ چنانچہ ہر ملک میں اور ہر زمانہ میں یہ بیوپاری مہاجن نہایت خوشحال رہے ہیں۔ یہودیوں کو دیکھ لیجئے کہ تعداد میں کم۔ جا بجا منتشر نہایت ستائی ہوئی قوم جس سے عام نفرت اور عداوت معلوم ہوتی ہے لیکن وہ خاموش اور مستقل طریقہ سے کڑی شرح سود پر روپیہ کا بیوپار کرتے رہنے سے روپیہ جمع کرنے میں کیسے حیرت انگیز طریقہ سے کامیاب ہوئے ہیں۔ جب خوشحالی کا یقین ہو جاتا ہے تو زیادہ سے زیادہ روپیہ پیدا کرنے کی حرص ہو جاتی ہے اور چونکہ دولت کے معنی ہیں قوت و اقتدار اس سے قرض دینے والا اپنی دولت کی قوت سے حاجتمند قرضخواہ پر پورا دباؤ رکھتا ہے اور قرض لینے والا اپنی حاجت کی وجہ سے خود کوئی مناسب شرط قایم نہیں کر سکتا۔ پس اگر حکومت نے مداخلت نہ کی تو قدرتی نتیجہ یہی نکلے گا کہ ایک فریق کی طرف سے دباؤ پڑے گا اور مغلوب فریق بے بس ہوگا قرضہ کی شرائط سخت تر ہو جائینگی۔

مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تاوانی شرحِ سود پر قرض لینا صرف ہمارے ہی واسطے مضر نہیں ہے بلکہ تمام ہندوستان کے لیئے ضرر رساں ہے۔ جب ہم خوشی سے اونچی شرح پر قرضہ لینے کو آمادہ ہو جاتے ہیں تو قرضہ دینے والا قرض دینے میں اغماض کرتا اور دوسری جماعتوں کے لوگوں کو بھی کم شرح سود پر قرضہ نہیں دیتا اور شرح سود کو رفتہ رفتہ بڑھاتا رہتا ہے۔ پس ہندوستان میں شرح سود جو زیادہ ہے اس کے کسی قدر ہم خود جوابدہ ہیں۔ اور ان شرحوں کو مغربی ممالک کی شرحوں سے کچھ نسبت نہیں ہے۔

زرِ امانت

سود کے خلاف خیالات میں ایسی شدت ہو گئی ہے کہ بہت سے اوقاف کے امناء وقف کا بچا ہوا زائد روپیہ بنک یا ڈاکخانوں کے سیونگ بنک میں جمع نہیں کرتے بلکہ خانگی لوگوں کے پاس امانت رکھتے ہیں ایسے افراد کے ہاتھ میں روپیہ جانے سے وہ روپیہ حقیقتاً بیکار نہیں رہتا۔ بلکہ اس کا فائدہ ان افراد کو جنھوں نے روپیہ اپنی امانت میں رکھا تھا پہونچتا ہے اور وقف کو مطلق نفع نہیں ہوتا۔ اس طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے کہ اس سے وقف کو کس قدر سخت نقصان پہونچتا ہے اس کا بھی کم خیال رکھا جاتا ہے کہ یہ روپیہ کس قدر خطرہ میں ہیں۔ یقینی یہ لوگ وقف کے روپیہ کو جو ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے اپنے اغراض

مقاصد میں استعمال کرکے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ لیکن اس استعمال کے معاوضہ میں وقف کو وہ کچھ بھی نہیں دیتے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئیے کہ اس روپیہ سے جو منافع اُن کو ہوا تھا اُس منافع کا کوئی حصّہ وہ وقف کو نہیں دیتے۔ اس کے علاوہ وقف کو یہ بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر امانت رکھنے والا بے ایمان ہو جائے یا وہ بے ایمانی نہ بھی کرے اُس کا دِوالہ نکل جائے تو کل روپیہ مارا پڑے گا۔ چنانچہ اس معاملہ پر سب سے زیادہ توجہ ہونی چاہیئے کہ ہر ایک ضلع میں اوقاف کا روپیہ محفوظ امانت میں مثلاً بنک میں جمع ہونا چاہیئے۔ اور غیر ذمہ دار لوگوں کے ہاتھوں میں غیر کاروباری طریقہ سے نہ چھوڑا جائے۔ یہی حال اُن نجی افراد کا ہے جن کو اپنا بچا ہوا روپیہ محفوظ رکھنا پڑتا ہے اور یہی حال پکّے دیندار مسلمانوں کا ہے اِن لوگوں کا یہ حال ہے اگر سُود کے حرام ہونے کا اِن کو پکّا عقیدہ نہ بھی ہو تو بھی احتیاط کی وجہ سے سود لینے کی تمامی صورتوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ پس میں ان لوگوں سے اپیل اور درخواست کرتا ہوں کہ حفاظت ہی کا پہلو نگاہ رکھتے ہوئے ذرا وہ غور تو کریں کہ اس بیسویں صدی میں ایا اپنے پس انداز کو زمین میں گاڑ دینا۔ لوہے کے صندوقوں میں بند کر دینا اور ہر وقت چوری کا خطرہ رہنا۔ قیمتی زیورات میں تبدیل کر دینا جس سے صرف یہی نہیں ہوتا کہ روپیہ معطل ہو جاتا ہے بلکہ مستورات کے واسطے ذاتی خطرہ بھی پیدا ہو جاتا ہے اچھا ہے یا یہ بہتر ہے اور دور اندیشی کی یہ بات ہے کہ اس سرمایہ کو گورنمنٹ کے محفوظ ڈاکخانہ کے بنک۔ امپیریل بنک آف انڈیا یا کسی دوسرے قابل اعتبار بنک اور گورنمنٹ کی ضمانت میں دیا جائے۔

امانتیں

ڈاکخانوں اور بنکوں میں جو روپیہ جمع کیا جاتا ہے اُس کے متعلق مجھے ایک معاملہ کا ضرور حوالہ دینا چاہیئے جس کی طرف مسلم جماعت کی خاص ضروری توجہ ہونی چاہیئے۔ اب فی صدی خاصی مسلمانوں کی تعداد نے یہ اصلیت سمجھ لی ہے کہ روپیہ امانت کرنے کا محفوظ طریقہ یہی ہے کہ وہ ڈاکخانوں اور بنکوں میں جمع کیا جائے اور اب اُن کی عادت ہو چلی ہے کہ اپنے پس انداز یا زائد روپیہ کو وہ ایسے ہی مقامات پر امانت رکھتے ہیں۔ لیکن ان امانت رکھنے والوں میں ضرورت سے زیادہ ایسے لوگ ہیں جو محض مذہبی خیال سے سود نہیں لیتے اور اپنے دعویٰ سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے ان دیندار مسلمانوں کو اس سے شاید آگاہی نہیں ہے کہ یہ سود کا روپیہ جو وہ چھوڑ دیتے ہیں بحقِ سرکار جمع نہیں ہوتا۔ بلکہ

اکثر "مکتی فوج" کو دے دیا جاتا ہے یہ مانا کہ مکتی فوج نہایت قابلِ ستایش طریقہ سے غریب درجہ کے لوگوں میں تمدّنی رفاہ کا کام کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ عیسائی مذہب کی تبلیغ کی کارروائی کو بھی وسعت دیتی ہے۔ پس اِن مسلمانوں کو جب اصلی واقعات معلوم ہوگئے تو کیا اس حال میں بھی بمقابلہ خلافِ اسلام عام تحریک میں اپنا روپیہ دینے کے سود لینے کو وہ زیادہ بڑا گناہ خیال کریں گے؟ بہتر ہے کہ وہ خود اس سود کے روپیہ کو نہ لیں لیکن یہ بھی نہ کرنے دیں کہ یہ روپیہ خلافِ شرع کام میں لگایا جائے۔ طرح طرح کی دشواریوں کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے مختلف سوالات کا قطعی فیصلہ کُن جواب دینے سے قصداً اعراض کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ مسائل اپنی وضع میں نیم مذہبی ہیں اور اِن کے جواب صرف مذہبی علماء ہی دے سکتے ہیں۔

افلاس

پچاس سال کی تحریکِ ترقی تعلیم کے بعد جس کا آغاز سر سید احمد خاں رحمۃ اللہ علیہ نے کیا تھا مغربی تعلیم کی طرف سے اب تعصب کسی قدر معدوم ہوگیا ہے۔ ہماری اعلیٰ تعلیم کے حصول کے رستہ میں اب سب سے بڑی روک تعصب نہیں ہے بلکہ "افلاس" ہے۔ بہت سے ہونہار اور مستحق طلباء یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کے والدین اُن کو کسی یونیورسٹی کالج میں اس لئے تعلیم نہیں دلا سکتے کہ ہندوستان جیسے غریب ملک کو دیکھتے ہوئے کالجوں اور بورڈنگ (دارالاقامتہ) کے مصارف بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں سختی کے ساتھ یہ تعصب بھی باقی ہے کہ کسی پیشہ۔ تجارت۔ محنت صنعت وحرفت میں ہاتھ نہیں لگایا جاتا۔ یہ تعصب یا کسرِ شان کا خیال اس غلط فخر سے پیدا ہوا ہے کہ ہم عالی نسب اور اعلیٰ خاندان کے ہیں۔ کس کے سامنے فریاد کی جائے اور کس سے دردِ دل بیان کیا جائے جبکہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہی اُمّتی جو اونٹوں کو مالِ تجارت سے بار کرکے دمشق کو پہنچنے کے واسطے لیجایا کرتے تھے آج اس سُنّت سے اعراض کر رہے ہیں توقع تو یہ تھی کہ جب ہمارے بزرگوں کی شریفانہ نظیر ہماری آنکھوں کے سامنے تھی تو ہم اِن پیشوں کو اپنا فخر اور اپنی شان خیال کریں گے۔ علاوہ ملازمت۔ سوداگری اور تجارت کے اور بھی تو بہت سے کام ایسے ہیں جن میں مصروف ہو کر ہم اپنی آمدنی بڑھا سکتے ہیں۔ مثلاً اسیر کی کاشت۔ میوے کے باغات۔ گھروں کے اندر رہ کر دستکاری۔ ہاتھ سے چلانے کی کلیں وغیرہ۔ لیکن چونکہ ہم عرب کی تہذیب وشایستگی سے دُور

جا پڑے اور صدیوں سے ابتدائی اسلامی تعلیم سے جدا ہو رہے ہیں۔ ہم میں وہی خصلتیں نشوونما پا گئی ہیں جو ہماری خوشحالی کی تباہی کا موجب ہیں اور ہم کو بدتر کرتی چلی جاتی ہیں۔ بدقسمتی سے سوائے لکھنے پڑھنے کے دوسرے پیشوں کی طرف سے ہمارے دلوں میں بیجا نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ ہم کو یہ فراموش ہو گیا ہے کہ کاروبار یا تجارت کوئی ذلیل کرنے والے کام نہیں ہیں نہ وہ لکھنے پڑھنے کے پیشوں سے کسی طرح حقیر ہیں۔ اور یہ کہ صرف لکھنے پڑھنے کے پیشہ سے سات کرور مسلمانوں کی اب پرورش نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ غلط خیال اس لیئے جاگزیں ہو گیا ہے کہ یہ بات نظرانداز کر دی گئی ہے کہ لکھے پڑھے لوگوں میں فیصدی چند ہی ایسے ہوتے ہیں جو اونچے درجوں پر پہونچکر درخشاں ہوتے ہیں لیکن ہزارہا ایسے ہیں جو ناکام و نامراد ہیں۔

گوڈرڈ صاحب نے افلاس کی تعریف اِن الفاظ میں کی ہے "ضرورت کی چیزوں کا ناکافی ہونا"۔ یہ تعریف مختصر اور بالکل صحیح ہے۔ جب مناسب صحت بخش غذا ہو۔ مناسب لباس ہو صحت آور مکان ہو۔ طبّی امداد موجود ہو۔ تعلیم ہو معمولی ضروریات کی چیزیں مہیّا ہوں تو عموماً افلاس نہیں ہے۔ خاص اسباب افلاس کے یہ ہیں کہ یا تو پیداوار ناکافی ہو یا نا انصافی کے ساتھ تقسیم یا نا برابر خرچ ہو۔ یہ باتیں اس وجہ سے پیش آیا کرتی ہیں کہ یا تو موقع قطعی مفقود ہو یا جہالت اور بے پروائی سے موجود موقع سے فائدہ نہ اُٹھایا جائے۔ اس کی وجہ کہ مسلمانوں کی جماعت کی نہ جسمانی تندرستی اچھی ہے نہ اُن کے چہروں پر شگفتگی ہے یہ ہے کہ اُن میں اُمنگ۔ سرگرمی اور عزم و ہمت۔ حوصلہ۔ ایجاد باقی نہیں رہے ایک مدت مدید سے وہ زندگی کی کشمکش میں پڑے ہوئے ہیں اور متواتر دھکوں اور ناکامیوں نے اُن کی جسمانی قوت کو خراب۔ اُن کی جوشِ ہمت کو کند اُن کی سرگرمی کو پامال اُن کے عزم کو برباد کر دیا ہے اور شکستوں کے خوف نے اُن کو اُداسی سے بھر کر توقع اور اُمید کے بجائے مردہ دلی کا شکار کر دیا ہے۔ اس نتیجہ کا اصل سبب اُن کی وہ ناچاری ہے جو اُن کے قطعی افلاس سے پیدا ہوئی ہے۔ جب کوئی نئی تحریک برپا کی جاتی ہے اتنا روپیہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ تحریک کامیاب ہو سکے۔ جب کوئی مفید مرکز قایم کیا جائے تو اتنا روپیہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ قایم رکھا جائے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نیچے درجہ کے مسلمانوں نے سخت محنت کی ہے اور بڑی دُھن سے جفاکشی کے ساتھ کام کیا ہے تاہم وہ سرمایہ داروں کے غلام رہے ہیں۔ اپنی سخت محنت کی بدولت اُن کے روح و قالب کا ساتھ تو

رہتا ہو لیکن نفع کا سب سے زیادہ حصّہ جو اُن کی محنت سے پیدا ہوتا ہو وہ سرمایہ دار کی جیب میں چلا جاتا ہو جو ان غریبوں کو قلیل مزدوریاں دیکر آپ جشن اُڑاتے ہیں۔ زیادہ غریب طبقے دستکاروں اور صنّاعوں کے ہیں جن کو دن بھر کی شدید محنت کے بعد بہت تھوڑی مزدوری ہاتھ آتی ہو۔ اُن کو زیادہ نفع نہیں ہوتا کہ وہ اپنی حالت کو قابلِ لحاظ درجہ تک سُدھار سکیں۔ اُن کو اُن کی محنت کے بقدر مزدوری مِل جاتی ہو اور کسی منافع کی گنجایش ہی نہیں ہوتی۔ صِرف وہ سرمایہ دار جو اُن کو مزدوری پر لگاتے ہیں بڑے بڑے منافع حاصل کرتے ہیں۔ اگرچہ بعض وقت اُن کو بڑے بڑے نقصان بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ افلاس ہی ہی جو تجارت، صنعت و حرفت اور نیچے درجہ کے لوگوں کی اقتصادی زندگی پر تنزل کا اثر رکھتا ہو۔ چنانچہ اِنھیں سے گداگروں کا اضافہ ہوگیا ہو کیونکہ افلاس ایک آدمی کو بھیک کی طرف اس طرح لیجاتا ہو کہ آدمی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور سب سے زیادہ اندوہناک یہ بات ہو کہ ہماری جماعت نے مصیبت کی اصلیت کو جس طرف ہم مجبور ہو کر آتے ہیں بخوبی سمجھا نہیں ہو۔

حالت پہ اپنی ہم کو کچھ افسوس بھی تو ہو
افسوس تو یہی ہو کہ افسوس بھی نہیں

کفایت شعاری

زندگی کی کامیابی کا راز کفایت شعاری ہو۔ اگر ہم ایک پیسہ بچاتے ہیں تو اُس کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے ایک پیسہ پیدا کیا۔ آمدنی کی بڑی مقدار آدمی کو ایسا امیر نہیں بناتی جیسا روپیہ پس انداز کرنے کی مقدار دولتمند کرتی ہو۔ ہر خاندان کی ضروریات کے لحاظ سے خرچ میں فرق ہوا کرتا ہو جس کے ساتھ معیارِ معاشرت کا بھی لحاظ ہوتا ہو۔ ایک بڑی آمدنی بھی ایک خاندان کو کافی نہیں ہوتی اُسی کے ساتھ یہ بھی ہو کہ اُس سے تھوڑی آمدنی دوسرے خاندان کو بس کرتی ہو۔ چنانچہ آمدنی کا لحاظ کرتے ہوئے خرچ میں تخفیف کر دینی چاہیئے۔ یہ عجیب ماجرا ہو کہ بہت سے کفایت شعار خاندان جن کی آمدنی قلیل ہوتی ہو کامیابی کے ساتھ اپنے مصارف میں کمی کر دیتے ہیں اور ایسے قلیل پر گزران کر لیتے ہیں کہ یقین نہیں آتا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ اخراجات کی زیادتی کا مدار زندگی کی اشد ضروریات پر اُس قدر نہیں ہو جس قدر معیارِ معاشرت پر ہو چنانچہ سادہ زندگی کے لیئے مختصر آمدنی کافی ہو۔ ہندوؤں کی بڑی جماعت کی کامیابی اِسی وجہ سے ہو کہ اُن کی زندگی سادہ۔ خوراک سادہ۔ اور لباس سادہ ہو۔ یہ بھی

حیرت کا مقام ہی کہ ہندوؤں کی آمدنی چاہے جس قدر قلیل ہو لیکن اُس میں سے بھی کچھ نہ کچھ پس انداز کر لیتے ہیں۔ اِس کے خلاف اُن کے مسلمان بھائیوں کا یہ حال ہی کہ زیادہ آمدنیوں کے باوجود وہ بدون مقروض ہوئے نہیں رہتے۔ اس معاملہ میں ہماری بدقسمتی ہی کہ ہم ایسی قوم کے مقابلہ میں رکھے گئے ہیں جو نہایت محنتی، کفایت شعار اور جزرس اقتصادی قوم ہی اور صرف دال ترکاری پر اپنی بسر کر سکتی ہی۔ اگر باہمی مقابلہ کی یہی حالت ہی تو لابدی یہی نتیجہ ہوگا کہ ہم پست ہوتے چلے جائیں گے کیونکہ آمدنیاں برابر اور ہمارے خرچ اونچے ہیں۔ اگر ہم اونچی طرز معاشرت رکھیں تو وہ اسی حالت میں حق بجانب ہو سکتی ہی کہ ہم میں اہلیت بڑھے کاہلی اور تضیع اوقات گھٹے اور ہم وقت کی اصلی قیمت سمجھیں چونکہ ہم اپنے مصارف گھٹا نہیں سکتے نہ اس قابل ہیں کہ زیادہ کمائیں ہم چھوٹے چھوٹے قطعات آراضی کی کاشت۔ چھوٹی چھوٹی دُکانیں رکھنے اور دستکاری سے بھی خارج ہو گئے ہیں۔ چھوٹا کاروبار جس سے قلیل آمدنی ہوتی ہی ہمارے خاندانوں کی پرورش کے لیئے ناکافی ثابت ہوا ہی۔ چنانچہ قلیل آمدنی کے پیشے بھی ہمارے ہاتھوں سے نکل گئے ہیں۔ پس جب تک ہم یہ عادت نہ ڈالیں کہ جتنی چادر دیکھیں اتنے ہی پاؤں پھیلائیں ہماری اقتصادی زندگی کا مضبوط اور پائدار اساس پر بحال ہونا محال ہی۔ جبتک ہر شخص اپنے اوپر یہ لازم نہ کرلے گا کہ ماہوار آمدنی سے ایک خاص معینہ رقم پس انداز کرے۔ اس سے چاہے ذاتی طور سے کسی قدر تکلیف بھی ہو۔ اور اسی کے ساتھ اپنی خواہشات لذات کو روکے قرض لینے سے مذہبًا خائف رہے۔ تب تک ہماری حالت سُدھر نہیں سکتی۔ جبتک ہم آمدنی سے زیادہ خرچ کرنے کی بربادکن عادت سے باز نہ آئینگے اور اس بے سروپا امید سے کہ ہم آئندہ کسی نامعلوم طریقہ سے قرضہ ادا کر دیں گے موجودہ ضروریات کو پورا کرنے کے لیئے قرض لینے کے لالچ کا شکار رہوتے رہیں گے تو بس یقین کر لیجیئے کہ جس نتیجے سے ڈرنا چاہیئے ہو کر رہے گا اور پھر ہمارا کہیں ٹھکانا نہیں ہی۔ ہم کو جاننا چاہیئے کہ اگر ہماری موجودہ آمدنی ہمارے موجودہ اخراجات کو کافی نہیں ہوتی اور ہم کو قرض لینے کی ضرورت ہوتی ہی تو یہی آمدنی آئندہ ہمارے اخراجات کو کس طرح کافی ہوگی جن میں خاندان کے بڑھنے سے یقینی اضافہ ہو جائے گا اس کے سوا چاروں طرف گرانی بڑھتی چلی جاتی ہی۔ پھر اس کے ساتھ اِن ناکافی آمدنی میں اِن قدر پس انداز کیسے ہوگا کہ ہم اپنا قرضہ بھی ادا کریں گے جو معہ سُود کے اب دوچند سے زیادہ ہو چکا ہوگا۔

لباس کا معیار قائم کر دینے سے جس کا اقتصادی نقطۂ خیال سے ارتقا ہوا ہی ممالکِ مغربی میں

بہت کچھ بحث عمل میں آئی ہی۔ فاسسٹ اٹلی نے تو ایک قدم اور آگے بڑھایا ہی اور اُس کا یہ ارادہ ہی کہ زنانہ لباس کا بھی معیار مقرر کر دیا جائے۔ یہ وہ بات ہی جو چند سال قبل ناممکن خیال کی جاتی تھی۔ لیکن ہندوستان میں لباس میں وہ مبالغہ اور اسراف ہی کہ اُس کی کوئی روک ٹوک نہیں یہی نہیں ہو کہ ہمارے لباس ضرورتاً فنونِ خیاطی اور اچھے طرز و تراش کے ہوتے ہیں بلکہ وہ نمایشی۔ نہایت پُر تکلف اور بسا اوقات نہایت چمکیلے اور بھڑکیلے بھی ہوتے ہیں۔ ہندوستانی جلسے میں انواع و اقسام کے لباس نظر آتے ہیں جن کی طرح طرح کی بناوٹیں اور رنگ ہوتے ہیں۔ سر سے لیکر پاؤں تک کے لباسوں میں بے شمار اقسام کی وضع قطع کا ایک طوفان برپا ہوتا ہی۔ شمار سے خارج مضحکہ خیز اکثر ایسے لباس ہوتے ہیں جن کی بھڑک میں صفت اور رنگ کے تناسب کا کوئی احساس نہیں کیا جاتا یعنی بدقطع اگرچہ زرق برق اور قیمتی صافے اور سلمے ستارے سے منڈھی ہوئی زردوزی ٹوپیاں فرقِ سر پر ہوتی ہیں لیکن نیچے پاؤں میں ٹکے کا ارزاں جوتا نظر آتا ہی۔ پس نہ تو یہ تراش خراش ہی نہ فنون سے اسے کوئی واسطہ ہی نہ یہ خوش مذاقی ہی ہی نہ کفایت شعاری ہی۔

ایک بات اور خیال میں رکھنے کی یہ ہی کہ صرف روپیہ کا پس انداز کرنا ہی کفایت شعاری نہیں ہی۔ زیادہ بڑی کفایت شعاریاں تو یہ ہیں کہ جو چیزیں ہمارے قبضہ میں ہیں اُن کو محفوظ رکھیں اور ان کو زیادہ عرصہ تک چلائیں۔ اگر ہم اپنی زندگی کا یہ قاعدہ مقرر کر لیں کہ اُن چیزوں کی جو ہمارے قبضہ میں ہیں نگہداشت و حفاظت کریں اور ہر دفعہ جبکہ ہم روپیہ خرچ کرنا چاہیں یہ خیال کریں کہ کیا اپنی معقول آسایش کا لحاظ کرتے ہوئے ہم اپنی اس ضرورت کو روک سکتے ہیں۔ تو بس۔ ہماری اقتصادی دُشواریوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اسی طرح سے اصولی طریقہ کے مطابق ہم کو اپنے کھانے کا بھی انتظام کرنا چاہیئے۔ ہمیں ضرورت سے زیادہ یہ عادت ہو گئی ہی کہ عمدہ کھانوں کے بہت سے اقسام ہوں جن کا ہضم کرنا دشوار اور جزوِ بدن ہونا مشکل ہوتا ہی علم الاغذیہ کے مطالعہ کی سخت ضرورت ہی کہ بے شمار کھانے کی قسموں میں سے جو آدمی کے استعمال میں ہیں ایسے کھانوں کا انتخاب ہو سکے جو بدن کو مناسب غذا پہونچا کر اُس کے نشو و نما کا ذریعہ ہوں۔

اسراف

زمینداروں اور تعلقہ داروں پر جن کے قبضہ سے جائدادیں جلد جلد نکل رہی ہیں فضولخرچی اور اسراف ایک عذاب کی صورت میں نازل ہو بے باکانہ اسراف نے بہت سے خاندانوں کو فاقہ زدہ کرکے تباہ و برباد کردیا۔ چنانچہ ہر مسلم کو اسراف کے خلاف قرآن مجید کی آیۃ شریف اپنے پیش خیال رکھنی چاہیئے وہ آیۃ یہ ہی۔ ”وَّکُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ“۔ یعنی ”تم کھاؤاور پیو لیکن اسراف نہ کرو۔ تحقیق خدا اسراف کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا“ (الاعراف رکوع ۳)

یہ سوال کیا جاسکتا ہی کہ اسراف کے حقیقت میں معنی کیا ہیں۔ جب ایک آدمی دوسرے معمولی دوراندیش شخص کے مقابلہ میں جو اپنی زندگی کی رفتار کے اعتبار سے اوسط درجہ کا ہوتا ہی۔ زیادہ خرچ کرتا ہی تو زیادہ خرچ کرنے والا یقیناً مسرف ہی۔ روپیہ آنہ پائی کے ذریعہ سے اسراف کی پیمایش نہیں کی جاسکتی جس درجہ کا آدمی ہوتا ہی اُسی کے موافق اسراف میں اختلاف ہوتا ہی۔ مناسب معیارِ زندگی یہ ہی کہ آمدنی کی تناسب سے خرچ رکھا جائے خرچ کا معیار اس غلط نظریہ پر نہ ہونا چاہیئے کہ معاشرت میں ہمارا یہ مرتبہ ہی یا زمانہ ماضی میں ہم اس رتبہ کے تھے۔ یہی متکبرانہ خیال خاص غلطی ہی۔ معیار زندگی قطعی اور بالکل اُس آمدنی پر منحصر ہونا چاہیئے جو ہم کو ہوتی ہو۔ پس جب آمدنی سے خرچ نہ بڑھے گا اور معقول پس انداز بھی کیا جائے گا اور قرضہ نہ لیا جائے گا۔ اسراف نہوگا۔ یہ تو فطرتی بات ہی کہ خیالات اور مذاق جُدا جُدا ہوتے ہیں لیکن اس پر تو زور دیا جاسکتا ہی کہ وہی چیز جو ایک شخص کی ضروریات میں داخل ہی دوسرے شخص کے واسطے صرف عیش کا حکم رکھتی ہی۔ یا اس کا عکس سمجھو۔ لیکن درجہ معاشرت کا ایک معیار یقینی ہونا چاہیئے۔ خواہ کسی درجہ کا انسان ہو۔ اور وہ معیار آمدنی کے تناسب سے ہو۔ اگر ایک ہی درجہ کے کافی تعداد کے لوگوں کے طرز معاشرت کا اندازہ کرلیا جائے تو اس اوسط معیار کا آسانی سے تعیّن ہوسکتا ہی۔ چونکہ اس اوسط سے خرچ رفتہ رفتہ بڑھتا چلا جاتا ہی وہ زیادہ تر اسراف کی حد میں پہونچ رہا ہی۔ مولانا حالی نے سچ کہا ہی کہ جب ہماری جماعت غریب ہی تو پھر زیادہ خرچ کردینا ایک عذاب ہی چنانچہ فرماتے ہیں ؎

اوراب۔ کہ نہ دولت ہی۔ نہ ثروت ہی۔ نہ اقبال	گھر گھر پہ ہی چھایا ہوا افلاس و فلاکت
ترغیب سخاوت کی ہی اب قوم کو ایسی	پرواز کی ہی چونٹیوں کو جیسی ہدایت

اگر ہم اپنے بچوں کو اُن کے لڑکپن ہی سے یہ تعلیم دیں کہ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے مصارف کا باقاعدہ حساب رکھا کریں تو اسراف کی عادتیں اختیار کرنے کی طرف سے ہمارا میلان بہت کچھ رُک سکتا ہے۔ اس قسم کی تربیت سے بچّوں کو ہمیشہ اپنی آمدنی اور خرچ پر نظر رکھنے کی ترغیب ہوگی اس طرح وہ زیادہ محتاط اور فضول خرچی سے دور ہوجائینگے۔

بیجا راہ خیرات

اُن لوگوں کے ساتھ نرمی کرنے سے جو ہمارے پاس آکر مدد کے طالب ہوتے ہیں ہم غیر محسوس طریقہ سے گداگری کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ مالی مدد دینے کو ہم مہربانی خیال کرتے ہیں اور یہ تکلیف کرکے تحقیقات نہیں کرتے کہ وہ موقعہ مدد کا مستحق بھی ہے یا نہیں۔ چنانچہ ٹکر گدے اور ننگے لوگوں کے لیئے ہماری نامناسب خیرات نے زندگی آسان کردی ہے۔ اس نامناسب خیرات نے اُن کو کاہل نکمّا اور بیکار کردیا ہے۔ اُن لوگوں کو جنھیں ہم فیاضی سے دیتے ہیں ہم بھیک مانگنے کا عادی بنادیتے ہیں اور پھر یہ لوگ بھیک مانگنے کو ایک پیشہ اور باقاعدہ ذریعۂ معاش خیال کرنے لگتے ہیں۔ اِس طریقہ سے ہم ان لوگوں کو بیکار اور کاہل بن جانے اور محنت کے مَیلان سے دست کش ہو جانے کی ترغیب دیتے ہیں ہماری فیاضی کا اُلٹا نتیجہ نکلتا ہے کیونکہ جن لوگوں کے ساتھ اس فیاضی کا اظہار کیا جاتا ہے یہ فیاضی اُن کا عزم اور ہمت لے لیتی ہے اور ایمانداری سے اپنی روزی کمانے کے قابل اُن کو نہیں رکھتی بے باکی سے بھیک اور خیرات دینا صرف روپیہ کا برباد ہی کرنا نہیں ہے بلکہ مادی طریقہ سے تمام قوم کے واسطے ضرر رساں ہے۔ بھکاریوں کے ساتھ ہماری نرم دلی بھکاریوں کو اپنی مصائب کے فرضی افسانے گھڑنے کی تعلیم دیتی ہے اور طرح طرح کے فریب سے وہ اپنی حاجتیں پیش کرتے ہیں۔ اس تعلیم کا نصاب ختم کرنے کے بعد اگر بہت سے کذاب مکار۔ چور اور دوسری وضع کے مجرم بن جائیں تو کیا تعجب ہے۔ آئے دِن یہ ہوتا ہے کہ ایک صاحب تشریف لاتے اور فرماتے ہیں کہ ریل گاڑی میں میرا اسباب چوری گیا۔ یا میرا سامان لوٹ لیا گیا۔ دوسرے کہتے ہیں کہ میرا رشتہ دار قریب بہ مرگ ہے۔ یا تجہیز و تکفین کے واسطے خرچ کی اشد ضرورت ہے۔ یا مَیں مسلمان ہوا ہوں اور میرے اعزّہ اور اقربا نے مجھے نکال دیا ہے۔ اور اس طریقہ سے ہمارے احساسِ ہمدردی سے اپیل کیا جاتا ہے۔ ہم اندھا دُھند ان لوگوں کی مدد کرتے ہیں اور اُن کی ہمت افزائی کرتے ہیں کہ اسی حاجت کا اعادہ کرتے ہوئے وہ گھر گھر مانگتے پھریں۔

چنانچہ سخت ضرورت ہے کہ خیرات دینے کا ایک باقاعدہ نظام قایم کیا جائے۔ اگر ہم ہر ایک شہر میں ایک مرکزی خیرات خانہ قایم کرلیں کہ صرف اُسی خیرات خانہ سے بشرطیکہ سائل مہتمم کو اپنی حاجت کی واقعیت کی طرف سے مطمئن کردے خیرات دی جایا کرے تو ہماری جماعت کو اِن ذلیل درجہ کے کاہل وجودوں سے جنھوں نے بھیک کو ایک پیشہ مقرر کر رکھا ہے بہت کچھ نجات ہو جائے گی اور نیک سرشت لوگ مصنوعی ضرورت پر بار بار دینے سے محفوظ ہو جائیں گے۔ تمام خوشحال لوگ جو اُس بستی میں ہوں اُسی ایک مرکزی خیرات خانہ میں بھیجا کریں اور جو سائل آئے اُس کو اِسی مرکزی خیرات خانہ میں جانے کی ہدایت کردی جایا کرے چنانچہ خیرات کے صحیح مصرف کا یہی ایک طریقہ ممکن ہے اور سب سے اچھا یہی طریقہ ہے۔ دینے والوں کو بھی اس تکلیف سے کہ بار بار سائل آتے اور تنگ کرتے ہیں چھٹکارا ہو جائیگا۔

ذوی القربا کی امداد مسجدوں اور مدرسوں کو عطیات کا حال جداگانہ ہے لیکن اگر اس میں بھی امتیاز سے کام نہ لیا جائے تو یہی مصرف غلط ہو جاتا ہے۔ ذرا احتیاط برتنے اور اس طریقہ کی نظرثانی سے روپیہ ضایع ہو جانے سے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔

محتاج خانے، یتیم خانے اور بیوہ خانے

مرکزی خیرات کا ایک اصول قایم کرلینے سے جس کا باقاعدہ خیراتی سرمایہ ہو آخر میں اس قدر روپیہ پس انداز ہو سکتا ہے کہ اُس سے محتاج خانہ بہ آسانی قایم ہو سکتا ہے جہاں معذوروں۔ بوڑھوں اور محتاجوں کو کھانا کپڑا اور رہنے کا مکان دیا جا سکتا ہے۔ یتیم خانے قایم ہو سکتے ہیں جہاں ایسے بچوں کو جن کے ماں باپ نہ ہوں کہ اُن کی نگہداشت اور پرورش کریں رکھ کر تعلیم و تربیت دی جا سکتی ہے بیوہ خانے قایم ہو سکتے ہیں جن میں مجبور اور بیکار عورتیں جن کا کوئی کفیل نہ ہو رکھی جا سکتی ہیں۔ پرورش کی جا سکتی ہے۔ مغربی ممالک میں اس قسم کے مراکز بن گئے ہیں اور لوگوں کی خیرات سے چل رہے ہیں۔ ان کی ہندوستان میں اشد ضرورت ہے کیونکہ حاجتمندوں کو مصیبت سے خلاصی دینے کی بہت حاجت ہے یہ ذریعہ بیکسوں کو فاقہ مرنے سے بچاتا اور غیر محفوظوں کو بربادی اور تباہی سے روکتا ہے۔

شادیوں کے مسرفانہ اخراجات

ہماری شادی بیاہ اور دوسری تقریبوں کے موقعہ پر جس قدر بے باکی سے صاحبِ تقریب کی حیثیت سے بہت زیادہ اسراف کے ساتھ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اس سے باہر والوں کو جیسی حیرت

ہوتی ہو ویسی حیرت کسی اور بات سے نہیں ہوتی۔مہان آتے اور دعوت و خوشی میں شریک ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ اُس روپیہ کا بڑا حصہ جو صرف کیا جا رہا ہی موروثی جاداد یں رہن کرنے یا قیمتی زیورات بیچنے اور گرو کرنے سے ایسی سخت شرح سود پر مہیا کیا گیا ہی جو چند ہی روز میں اِس قدر زیادہ ہو جائے گا کہ جائداد کو واگزاشت کرنا محال ہو جائے گا۔ یہ خیال نہایت احمقانہ اور غلط ہی کہ خاندان کی شانِ ماضی کے بلند پیمانہ پر شادی میں صرف ہونا چاہیئے۔خاندان کی شانِ ماضی کا یہ حال ہی کہ اُسکی دولت اور جائداد تو سب معدوم ہو چکی صرف نام ہی نام باقی ہی اور اس کا جواب دِہ حقیقت میں خاندان کا اسراف تھا۔اسلام میں نہایت سادہ شادی کا دستور تھا یا یوں کہیئے کہ شادی خود سادگی تھی سوائے نکاح کے اور رُسوم اور ضوابط کی ضرورت نہ تھی۔شان۔دھوم دھام نمایش وغیرہ کا مذکور نہ تھا لیکن پچھلی چند صدیوں سے ہم نے اپنی ہموطن جماعتوں سے یہ رسوم جن میں شدت سے فضول خرچی ہوتی ہی مع خود ان کے بعض رسوم کے مستعار لیئے ہیں۔آجکل اگر مسلمانوں میں شادیوں کے رسوم غور سے دیکھے جائیں تو وہ ہندوؤں کی شادیوں کے رسوم سے اس قدر مشابہ ہیں کہ حیرت ہو جاتی ہی۔اِن رُسوم کی تہہ میں بہت سے خیال مضمر ہیں اگرچہ اُن میں سے بعض پر عمل اب نہیں ہوتا۔بہت رسمیں دولھا دولھن کی باہمی محبت۔آئندہ خوشی اور صاحب اولاد ہونے کے متعلق بطور شگون کے عمل میں لائی جاتی ہیں۔یہ بھی محض عقیدہ ہوتا ہی کہ ان مختلف رسوم کے بجالانے سے نہایت خوشحالی ہوگی اور کثرت سے اولاد ہوگی۔اس کے علاوہ دولھا دولھن کی طرف سے بعض حریفانہ رسمیں ایک دوسرے پر غالب آنے کے لیئے کی جاتی ہیں اور اکثر ایک فریق کی طرف سے یہ کوشش کی جاتی ہی کہ رسم کامیابی سے ہو مگر دوسرا فریق اُس کو بے اثر کر دینا چاہتا ہی۔علاوہ اُن رسوم کے جو ایک فریق دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کو عمل میں لاتا ہی بہت سی رسمیں آسیبی اثر کو دُور رکھنے کی غرض سے کی جاتی ہیں یہ خیال کر لیا گیا ہی کہ دولھا دولھن کو نظر لگ جاتی ہی اور آسیب کا خلل ہو جاتا ہی۔بعض رسوم ایسی ہیں کہ قدیم زمانہ کی شادی کی یادگار ہیں جبکہ دولھن کو گرفتار کر لینے سے شادی ہوا کرتی تھی۔بعض ایسی رسمیں ہیں کہ اُن کی علتِ غائی تواب فراموش ہو گئی ہی مگر کہا جاتا ہی کہ وہ مسلمہ دستور ہیں۔بعض ایسی رسمیں ہیں جن سے دولھن کا حُسن افزوں ہو جانے کی توقع کی جاتی ہی ظاہر ہی کہ یہ سب ضعیف الاعتقادی کے وہم اسلام کے پاکیزہ اصول کے خلاف ہیں جنھوں نے سعد اور نحس شگونوں کو تسلیم نہیں کیا ہی۔اس قدر بیہودہ اور ایسی

کثرت سے یہ رسمیں ہیں کہ اُن کا شمار نہیں ہوسکتا اور صوبے صوبے میں وہ مختلف ہیں پس اُن کی تفصیل میں نہ کرونگا۔ لیکن ایک مبصر اُن کو دیکھ سکتا ہی۔ میرا تعلق تو اُن کے نتیجے سے ہی کہ اُن رسوم کی تیاری اور عمل میں لانے سے کس قدر غیر ضروری اسراف ہوتا ہی۔ اُمید ہی کہ تعلیم یافتہ مسلمان ان باطل پرستیوں سے جو ہماری شادی کے آئین میں داخل ہوگئی ہیں کنارہ کش ہو جائیں گے۔

بڑا جہیز

ایک ہندو کی لڑکی اور مسلمان کی لڑکی کی حالت میں جو بین فرق ہی ہم کو یہ فرق ہرگز فراموش نہونا چاہیئے۔ یعنی شادی کے بعد ہندو کی لڑکی تو اپنے شوہر کے خاندان میں منتقل ہو جاتی ہی اور پھر متوفی کی جائداد پر اُس کا کوئی دعویٰ باقی نہیں رہتا۔ پس ایسی لڑکی کو اگر زیادہ جہیز دیا جائے تو قرینِ انصاف ہوسکتا ہی کہ بس اب یہی وہ آخری حصہ ہی جو اُسے اپنے باپ کی جائداد سے مل رہا ہی۔ لیکن اِس کے خلاف مسلمان کی لڑکی کا یہ حال ہی کہ (شادی کے بعد بھی) وہ اپنے باپ کے خاندان کی رُکن رہتی ہی اور بھائیوں کے مقابلہ میں والدین کے متروکہ میں حصہ دار ہوتی ہی۔ وہ اپنا پہلا حق کھو نہیں بیٹھتی بلکہ اُسکو ایک دوسرا حق اور پہونچتا ہی یعنی شوہر کی جائداد میں بھی وہ حصہ پاتی ہی چنانچہ کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ ہندوؤں کی مساوات سے مسلمان لڑکی کو کثرت سے جہیز دیا جائے۔ اور اس کثرت سے دیا جائے کہ وہ باپ کی حیثیت سے بہت زیادہ ہو۔ خوش نصیبی سے مسلمانوں میں دولھن کے باپ سے تاوانی مقدار میں جہیز طلب کرنے کا طریقہ نہیں ہی۔ نہ ہمارے یہاں یہ رواج ہی کہ دولھا کے واسطے سب سے زیادہ نیلامی بولی بول کر اُس کو نیلام میں گویا خرید لیا جائے۔ لیکن بایںہمہ بڑے بڑے جہیز دینے کا رواج موجود ہی۔ یہ رواج قطعی غیر ضروری ہی جس سے شادیوں کے مصارف بہت بڑھ جاتے ہیں۔

حد سے زیادہ مہر

شادیوں کے موقعوں پر بڑے بڑے مصارف فریقین کو کرنے پڑتے ہیں۔ دولھا کے دوش پر بہت بڑے دَینِ مہر کا بار آئندہ کے واسطے شادی کے زرِ ضمن کے طور پر رکھدیا جاتا ہی۔ ابتدائی ایام اسلام میں تو بڑے بڑے مہروں کا مذکور سُننے میں بھی نہ آتا تھا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوب صاحبزادی تھیں یا خود حضرتؐ کی ازواج مطہرات کا مہر پانسو (۵۰۰) درہم سے کبھی زیادہ نہ ہوا۔ اور یہ پانسو درہم ایک سو سات (۱۰۷) روپیہ کے مساوی عام طور سے

خیال کیئے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس میں کسی قدر غلطی ہے۔ امام نووی مسلم شریف کے بڑے شارح۔ صحاح ستہ کی ایک حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "معنی ھذا الکلام کراھۃ الاکثار المھر الی حال الزوج" اور اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ بڑا مہر جو شوہر کی حیثیت کے مناسب نہ ہو کراہت کی بات یعنی مکروہ ہے"

بے شک وشبہ یہ بھی دستور تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہوتا تھا دین مہر فوراً ادا کر دیا جاتا تھا جب عیاشانہ عادتیں بڑھیں اور بدنصیبی سے کبھی کبھی تعدد ازدواج کا چرچا ہوا اور اسی کے ساتھ معاملہ طلاق میں طلاق الغائی عمل میں آنے لگی تو اس بات کی ضرورت پیدا ہوئی کہ شوہروں کے طرز عمل اور تلون مزاج کے خلاف ازواج کی حفاظت کی جائے پس مہر کی بڑی مقدار سے جو عندالضرورت طلب کیا جا سکتا تھا ایک کارگر تدبیر نکالی گئی پچھلی صدی تک اس تدبیر نے مُدعا پورا کیا لیکن اُن دنوں میں یہ خیال کبھی نہ ہوتا تھا کہ پورے دین مہر کا عدالت میں دعویٰ رجوع کیا جائے اور چونکہ دین مہر کی مقدار میں مبالغہ بھی ہو گیا تھا پورے دین مہر کا دعویٰ قابل عمل بھی نہ تھا لیکن اُس زمانہ کے حالات اب بدل گئے ہیں۔ رائے عامہ زیادہ قوی ہو گئی ہے۔ تعدد ازدواج کی صورت شاذ رہ گئی ہے۔ طلاقوں میں بہت کمی آ گئی ہے۔ ان کے معدوم ہونے سے بڑے بڑے مہروں کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ چنانچہ اب شوہر کی حیثیت کے لحاظ سے مہر مقرر ہونے چاہئیں جن کی مقدار غیر معمولی زیادہ نہ ہو۔ مہر کی مقدار مناسب مقرر کرنی چاہیئے "مہر مثل" کی روایت پر اصرار نہ کیا جائے کیونکہ وہ بے شک بہت زیادہ ہوتا تھا۔ اور جب مہر کی مقدار مقرر کی جائے تو رتبہ اور مرتبہ کا غلط خیال بھی درمیان نہ آنا چاہیئے۔ پس ضرورت ہے کہ امراء اور اعلیٰ طبقہ کے لوگ اس معاملہ میں راہبر بن کر اپنی مثال دکھائیں اور متوسط اور نیچے درجہ کے لوگوں میں مہر کی مقدار گھٹا دیں اونچے مہر حقیقت میں بڑے خسارہ کی بات ہیں جن سے ساہوکاروں اور قرض دینے والوں کی نگاہ میں شوہر کی آبرو گھٹ جاتی ہے اور پھر اگر کسی اشد ضرورت کی وجہ سے قرضہ لینا ہو۔ اور یہ ضرورت بسا اوقات پیش آتی رہتی ہے تو سوائے اونچی شرح سود کے روپیہ قرض نہیں ملتا اور اس سے خاندان متعلقہ کی بربادی ہو جاتی ہے۔ عید۔ شب برات کے تیوہاروں۔ متوفی کے بعد شدت سے ماتمی رسوم بجا لانے میں اور تاریخ وفات سے مقررہ ایام کے بعد چہلم۔ چھ ماہی۔ برسی کرنے میں۔ محرم کے منانے۔ نکاح۔ منگنی۔ بسم اللہ۔ ختنہ اور بچہ پیدا ہونے کی تقاریب میں اکثر خوشی منانے سے کثیر روپیہ برباد کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اب وقت

آگیا ہو کہ ہم اس واقعیت کو سمجھیں کہ خاندان کی حیثیت سے زیادہ ایسے مواقع پر خرچ کر دینا کہاں تک روا رکھنا چاہیئے۔

رشوت اور جھوٹے حلف

رشوت کے رواج کو تسلیم کرنا کتنا ہی شرمناک سہی لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کے مختلف محکموں اور دفتروں میں رشوت اب بھی جاری ہو۔ باقاعدہ رشوت شاید ایسی عام نہیں ہو لیکن نذرانے اور خفیف رقوم تو ایک عہدہ کے جائز حق شمار ہو رہی ہیں اور اُن کا جاری رہنا ہماری رواداری پر منحصر ہو۔ چنانچہ ایسے عام رواج سے محکموں اور دفتروں میں اپنی جائز دادرسی کے واسطے رسائی پانا بڑے صرفہ کا معاملہ ہو گیا ہو۔ عام رائے کا یہ حال ہو رہا ہو کہ ان خفیہ حرکتوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے اپنی بے اعتنائی سے وہ اِن حرکات کی ہمت افزائی کر رہی ہو۔ چنانچہ اُن لوگوں کے خلاف جو بے ایمانی سے اپنی روزی پیدا کرتے ہیں اگر ایک قوی احساس پیدا ہو جائے اور اگر جھوٹے حلفوں کے خلاف یہ خیال کیا جائے کہ اس عیب سے آدمی کی عزت گھٹ جاتی ہو یا دوسرے جرائم مثلاً جعلسازی۔ دغا اور فریب اصلی حقارت کی نظر سے دیکھے جائیں تو موجودہ حالات کے اندر بہت کچھ عام اصلاح ہو سکتی ہو۔

مقدمہ بازی

چونکہ شہادت کی باگیں ڈھیلی ہیں لازمی نتیجہ یہ نکلا ہو کہ اب کثرت سے مقدمہ بازی ہونے لگی ہو اور عدالتی کارروائیوں میں غیر ضروری طوالت ہو گئی ہو۔ ہندوستانی مقدمہ باز کی مقدمہ بازی کی طرف سے طبیعت کی پرواز اگر ضرب المثل نہیں ہوئی ہو تو بدنام تو ضرور ہو گئی ہو۔ کوئی شبہ نہیں کہ اس الزام میں بہت کچھ صداقت ہو۔ ذرا ذرا سی باتوں پر بھی جو تسلیم کر لی جانی چاہئیں۔ جوابدہیاں کیجاتی ہیں اور بیکار ابتدائی اور مرافعہ کی عدالتوں تک مقدمہ چلایا جاتا ہو۔ روپیہ کے مقدمات میں مسلمان عموماً مقروضوں کی صف میں ہوتے ہیں۔ اگر صرف اتنی سی بات سمجھ لی جائے کہ غیر ضروری اور جھوٹی بیکار جوابدہی کو دیوانی مقدمات میں طوالت دینے سے انجام کار برباد کر دینے والا اثر پڑتا ہو اور ایمانداری اور سچائی کے ساتھ دعویٰ تسلیم کر لینے کے مقابلہ میں زیادہ نقصان ہوتا ہو تو بے باکی سے روپیہ برباد کرنے اور محنت ضایع کرنے میں فضول اختلاف معدوم ہو جائے گا۔ چنانچہ قانون پیشہ

لوگوں کا یہ اہم فرض ہو کہ اس معاملہ میں مُوکلوں کو صائب مشورہ دیں اور بے باکانہ مصارف اور محنت کو روکیں۔ اس بات کی بڑی زبردست کوشش ہونی چاہیئے کہ معاملات عدالت سے باہر باہمی مصالحت یا پنچایت سے طے کر لیئے جایا کریں۔

باب چہارم

مسائل جن سے ہماری قومی زندگی پر اثر پڑتا ہو

سب سے زیادہ اہل کی بقا

ہمارے دماغوں کی پرواز اُمید افزا واقع نہیں ہوئی ہو بلکہ وہ ہمت شکن اور مایوسانہ ہو۔ ہمارے دماغوں میں یہی سما گیا ہو کہ پچھلا گزرا ہوا زمانہ ست جگ تھا اور ہمارے بزرگ فائق لوگ تھے اور ہمارا یہ عقیدہ ہو گیا ہو کہ ہم اُن کے برابر نہیں ہو سکتے اور ہم کو یہ بھی یقین ہو گیا ہو کہ اُن لوگوں نے جو کچھ کہا یا کیا وہی سب سے بہتر اور ارفع تھا۔ اِس خیال کا اب براہِ راست مغرب کے لوگوں کے ہمت افزا خیال سے موازنہ و مقابلہ کرو۔ مغربیوں کا یہ خیال ہو کہ انسانی نسل سائنس و رفنون میں برابر ترقی کرتی چلی جاتی ہو اور بدون روک کے علم و تہذیب میں آگے بڑھ رہی ہو اور مادّی خوشحالی میں برابر زیادتی کر رہی ہو۔ بس اسی خیال سے اُن کو یہ احساس ہو کہ اگر ہم کافی طریقہ سے سعی کرینگے تو اپنے بزرگوں سے سبقت لیجائینگے اور اُن سے بلند تر سطح پر پہونچ جائیں گے۔ جب اُن کی دماغی حالت یہ ہو تو اُن کو کام کی ترغیب اور بلند حوصلگی کی تحریک ہوتی ہو۔

اس کا سراغ لگانے کے ارادہ کے بغیر کہ اصولِ ارتقا کتنی بہت سی منزلوں سے ہو کر گزرا ہو اور بغیر یہ بتلائے کہ لامارک کے علم الحیوانات کی رائے کی ویلیس اور ڈارون کے اصول نے کس طرح جگہ لے لی یا ویزمان نے لامارک کی رائے میں شک کیا یا ڈارون سے اختلاف کیا، ایک شخص پوری طرح سے کہہ سکتا ہو اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ "فطرت کے انتخاب عمل میں موجودہ ماحول کے واسطے سب سے زیادہ موزوں چیزیں سب سے زیادہ اہل ہیں" اطراف و جوانب میں خاص حالات کے موجود ہوتے ہوئے اس میں کوئی شک نہیں ہو کہ میلان یہی پایا جاتا ہو کہ باقی وہی رہے جو قابل ترین ہو یعنی اُسی کو بقا ہو

جو مخالف حالات کا مقابلہ کرنے کے لیئے سب سے زیادہ اہل ہو۔ ہر نسل کے لوگ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لیکن موجود رہنے کے لیئے جو سب سے زیادہ اہل ہوتے ہیں وہی آسانی سے باقی رہتے ہیں۔ ضرورتِ زمانہ یا ضرورتِ مقامی کے لحاظ سے جو وضع خلاف ہوتی ہی فطرت اُس پر رفتہ رفتہ اور مخفی طریقہ سے کھود کر پھینکدینے کا عمل کرتی ہی۔ اگر ہم گِرسے گری منڈیل کے قانونِ فقدانِ انواع اور شاذ حالتوں میں رَبّ النوع کی طرف عَود کرنے کو مان بھی لیں تب بھی آخر میں فطرت کا عمل انتخاب یہی عمل نظر آتا ہی کہ نااہل کو چُن لے اور اُنھیں کو محفوظ رکھے جو موجودہ ماحول کے مناسب حال ہوں اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہی کہ اگر ہم زندگی میں کامیاب نہوں اور ویسی ترقی نہ کریں جیسی ہم کو کرنی چاہیئے تو اس میں قصور اسی کا ہی کہ ہم اپنے ماحول کے لیئے موزوں نہیں ہیں۔ اگر ہم اس واقعہ کی عین وقت پر قدر شناسی نہ کریں اور اپنے تئیں اُن حالات کے مناسب نہ بنائیں جن میں ہم رکھے گئے ہیں تو ہم اپنے تئیں فطرت کی ہم آہنگی کے زیادہ اور زیادہ خلاف پائینگے اور پھر ایک وقت آئے گا کہ فطرت ہماری اولاد کو اپنی ضروریات کے خلاف پاکر نفرت کے ساتھ رَد کردے گی (مولانا حالی رحمۃ اللہ نے کس اختصار اور فصاحت سے ایک بند میں یہ مضمون ادا کیا ہی:

زمانہ کا دِن رات ہی یہ اشارا کہ ہی آشتی میں مری یاں گزارا
نہیں جن کو صحبت ہی میری گوارا اُنھیں مجھ سے کرنا پڑے گا کنارا

سدا ایک ہی رُخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

پس یہ ہمارے شایان شان نہیں ہی کہ اُداس ہو کر بیٹھ جائیں اور اپنی تقدیر پر شیون و بُکا کریں۔ نہیں بلکہ ہمارا یہ صاف فرض ہی کہ اپنے عزم و ہمت کو فراہم اور اپنی جرات کو جمع کرکے اس کشمکش کا مقابلہ کریں اور پختہ عزم کرلیں کہ ہم سرخرو اور کامیاب ہوں گے۔ اگر ہم اپنے ذاتی تجربہ سے جو چند پشتوں سے ہو رہا ہی اس نتیجہ پر پہونچیں کہ قوم کے لحاظ سے ہم پست ہو رہے ہیں تو ہم کو پہچان لینا اور تسلیم کرلینا چاہیئے کہ ہماری تہذیب و شائستگی میں کچھ غلطی ہی۔ ہم کو فوراً اس آزار کی تشخیص کرنی چاہیئے اور جس قدر جلد ممکن ہو ایک نسخہ تجویز کرکے شفایاب ہونے کا انتظام کرنا چاہیئے ورنہ اس مسلسل انحطاط سے ہمارا مرض مُزمن ہو کر لاعلاج ہو جائے گا۔ ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ فطرت

کی پیداواروں میں تسلسل اور تدریج موجود ہی اور نتیجہ خیز انتخاب برابر جاری ہی۔ کمزور عناصر برباد کیئے اور زیادہ قوی محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ جماعت میں قدرتی بوسیدگی اور اُس کے ساتھ ساتھ تعمیر کا عمل جاری ہی۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری خصائل زندگی خواہ وہ ذاتی ہوں یا ہم نے اُن کو کسی سے حاصل کیا ہو ہماری اولاد کو ترکہ میں پہونچتی ہیں۔ پس اگر ہم اپنی اولاد کی تمدنی ارتقا کے مہتم بالشان عمل میں اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو بالضرور ہم کو اپنے تئیں ترقی دینا چاہیئے۔ ہماری زندگی کے حالات میں ترقیاں اور اصلاحیں تعلیم اور صاف ہوا اور صفائی کی عادتیں یہ سب ہی تو ہماری اولاد کے مزاج اور چال چلن پر اپنا اثر رکھتی ہیں۔ اس لیئے ہم صرف اپنی ذاتوں کے ہی محافظ نہیں ہیں بلکہ آئندہ نسل کے محافظ اور امین ہیں اور ملک کے ساتھ ہمارا صاف فرض ہی کہ خود اپنی خاطر اور اُن کی خاطر جو ہمارے بعد آنیوالے ہیں اپنی حالت کی اصلاح کریں۔ بڑی شخصیتوں کے افراد بڑے بڑے کام انجام دے سکتے ہیں اسلیئے آئیے سخت محنت کے واسطے ہم چال چلیں۔ بدن اور دماغ کی قوت محفوظ عزم و ہمت اور مستحکم ارادہ۔ عادۃ کی سادگی زندگی کی پاکیزگی اور خاندان کے استحکام کے ساتھ ساتھ حاصل کرنے کی سعی کریں۔

شادیوں کی رجسٹری

نکاحوں کی قابلِ وثوق تحریر نہونے کی وجہ سے بڑی دشواریوں کا سامنا ہوتا ہی۔ مسلم خاندان نالش کرنے پر مجبور رہوتے ہیں جن میں بڑے مصارف پڑتے ہیں۔ ان نالشوں کے فیصلوں میں بہت وقت لگ جاتا ہی اور پھر بھی نتیجہ کی طرف سے تیقّن نہیں ہوتا کیونکہ زبانی شہادت پر دارومدار ہوتا ہی چونکہ آخری کامیابی زبانی شہادت کی مقدار پر منحصر ہوتی ہی اُس کے فراہم کرنے میں بڑی کوشش کرنی پڑتی ہی اور چاہے یہ بات کیسی ہی افسوسناک ہو لیکن کہنی ہی پڑتی ہی کہ عدالت میں پیش کرنے کے لیئے جھوٹی اور سکھائی ہوئی شہادت پیش کرنے کا لالچ بہت کچھ دامنگیر ہونا چاہیئے۔ ہر شخص کو اس کا تجربہ ہی کہ ایسے بے شمار مقدمات ہوتے ہیں جن میں نکاح کی واقعیت یا جواز سے انکار کیا جاتا ہی یا دین مہر کی مقدار پر بحث کی جاتی ہی یا طلاق کا عذر پیش کیا جاتا ہی یا ولدیت تسلیم نہیں کی جاتی یا نکاح غلط بیان کیا جاتا ہی۔ ایسے پُرخطر اور بدنصیبی کے جھگڑوں میں کثرت سے روپیہ اور محنت صرف کی جاتی ہی اور کس قدر افسوس کی بات ہی کہ کوئی تحریری کاغذات ایسے موجود نہیں ہوتے کہ ایسی بربادی رک جائے اگر فریقین کو یہ آگاہی ہو کہ قابل وثوق ایسے کاغذات موجود ہیں کہ وہ عدالت میں جلد پیش ہونے سے

معاملہ کی روئداد پھاوی ہوکر معاملہ کو اپنی گرفت میں لے لیں گے تو بہت سے خاندان بر باد کن۔ مصارف طلب طولانی مقدمہ بازی سے محفوظ رہینگے۔ مسلم جماعت کا ان خانگی تنازعات میں روپیہ خرچ کرنا قطعی روپیہ کا برباد کرنا ہے اور اگر ہم صرف اُن دستوروں کی جن کا ترقی یافتہ ممالک میں رواج ہے پیروی کریں تو یہ بربادی بہ آسانی بچ سکتی ہے محض روپیہ کے۔ بیوہار سے عقدِ نکاح زیادہ سنجیدہ۔ وقیع اور اہم ہے اور پھر بھی ہماری یہ شومیِ طالع ہے کہ اُس کو معرضِ تحریر میں نہیں لاتے باوجودیکہ دوسرے قرضوں کی ہمارے پاس تحریری دستاویزیں ہوتی ہیں۔ قرآن مجید میں تو صریح حکم موجود ہے کہ اِذَا تَدَایَنۡتُمۡ بِدَیۡنٍ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکۡتُبُوۡہُ ؕ وَ لۡیَکۡتُبۡ بَّیۡنَکُمۡ کَاتِبٌۢ بِالۡعَدۡلِ ۪ یعنی "جب تم ایک میعادِ مقررتک اُدھار کا لین دین کرو۔ تو اُس کو لکھ لیا کرو اور تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھدے" (سورۂ البقرہ رکوع ۳۹) اور پھر اسی کے سلسلہ میں آگے حکم ہے "وَ لَا تَسۡـَٔمُوۡۤا اَنۡ تَکۡتُبُوۡہُ صَغِیۡرًا اَوۡ کَبِیۡرًا اِلٰۤی اَجَلِہٖ ؕ یعنی" اور معاملہ میعادی چھوٹا ہو یا بڑا اُس کے لکھنے میں کاہلی نہ کرو۔"

یہ بھی اگر فرض کرلیا جائے کہ امر کے صیغے استعمال ہوئے ہیں مگر آیتوں سے مراد صرف ہدایت ہے نہ کہ حکم تو بھی اِن ہدایتوں کی اطاعت و فرماں برداری کے لحاظ سے ہمارا صاف فرض یہی ہے کہ دَین مہر کی تفصیل لکھ لیں کہ کبھی آئندہ جھگڑا پیش آنے پر یہ تحریر ایسا قابلِ اطمینان ثبوت ہو کہ بحث کی گنجایش نہ رہے۔ میں یہ جسارت نہیں کر رہا ہوں کہ نکاح کی رجسٹری لازمی ہے بلکہ یہ کنایہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اپنی مرضی و خوشی سے رجسٹری کا قاعدہ اُسی طرح آغاز کریں جیسا ایکٹ ۱۸۷۶ء کے ماتحت بنگال میں جاری ہے۔ سنّی اور شیعہ قاضیوں کے تقرر سے شہروں میں اور نائب قاضیوں کے تقرر سے قصبات و دیہات میں ایک ایسے نظام کا وجود ہو جائے گا کہ اُس سے مسلمانوں کے نکاحوں کے تعلقات پر ایک نظر رہے گی اور وہ بہت کچھ مفید ثابت ہوگا۔ عادۃً ایسے عہدہ دار جھگڑوں کی حالت میں ثالث کا کام دینگے۔ معاملات آشتی سے طے ہو جایا کریں گے اور بہت سے مقدمات میں عدالت دیوانی سے چارہ جوئی کی ضرورت نہ رہے گی۔

نکاحوں کی رجسٹری سے ایک اور بڑا اقتصادی فائدہ یہ ہوگا مہر کی مقداروں کے متعلق باوثوق ثبوت موجود ہوگا اور یہ دستاویزیں میاں بیوی اور دوسرے ورثا کے باہم مقدمہ بازی ہی کی

نہ روک دینگی بلکہ قرض دینے والوں کے خلاف بہت کچھ مفید ثابت ہونگی۔ عام میلان یہ ہو رہا ہے کہ مُدعی اپنے دعاوی میں مبالغہ کر دیا کرتے ہیں بعض اوقات عدالتوں کے سامنے مہروں کی مقدار بڑھا چڑھا کر پیش کی جاتی ہے اور اس سے عدالتیں بہت شک کرنے لگی ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جب اُن کے سامنے بڑے دَین مہر کا مقدمہ آتا ہے تو اُس کو بڑی متعصبانہ طریقہ سے دیکھتی ہیں۔

مسلمانوں کو دائنوں کے خلاف مقدمات میں یہ اور دشواری پیش آتی ہے کہ وہ رشتہ داروں دوستوں شناساؤں اور متوسلین کی زبانی شہادت سے دعویٰ کی صحیح مقدار ثابت کرتے ہیں کیونکہ نکاح کے وقت ایسے ہی لوگ موجود ہوتے ہیں لیکن اگر ایسی تحریری دستاویزیں موجود ہوں جن میں کلام کی گنجایش نہ ہو تو صحتِ دعوے کے متعلق عدالتوں کو آسانی سے یقین دلایا جاسکتا ہے اور مسلم خواتین کو پھر اپنے حق بجانب دعوی میں کبھی خسارہ نہو بلکہ وہ اپنے مدیون شوہر کی جائداد سے صحیح حصّہ پانے کے قابل ہو جائیں۔ قانون کی رو سے بیویاں جن کے مہر ادا نہیں ہوئے ہیں وہی منصب رکھتی ہیں جو دوسرے دائنوں کا ہوتا ہے اور وہ شوہروں کی جائداد کو دائنوں سے بحصہ مساوی تقسیم کرا لینے کا استحقاق رکھتی ہیں۔

قانونِ وقف

اِسلام عملی مذہب ہے۔ پس اُس نے انسانی کمزوریوں کو جب کہ انسان شدید ضرورت سے ایسا زیربار ہو جاتا ہے کہ وہ بوجھ اُس سے اُٹھ نہیں سکتا پوری طرح تسلیم کیا ہے۔ اُس نے انسانی دماغ کی پرواز کا کہ وہ کس طرح فوری اور جلد گزر جانے کی ضرورت یا خوشی کی خاطر اپنی قیمتی جائداد علحدہ کر دیا کرتا ہے لحاظ کیا ہے۔ ہمارے مذہب نے والدین یا خاندان کے سردار کا یہ فرض خیال کیا ہے کہ خاندان اور اولاد کے واسطے وہ مناسب اور مستقل گزارے کا انتظام کر دے۔ چنانچہ اُس نے "وقف علی الاولاد" کا مسئلہ جاری کر دیا اور یہ ہندوؤں کے مشترکہ خاندانی انتظام اور رواج سے بھی زیادہ خاندانی جائداد کی حفاظت کے لئے کارگر ہے۔ ایسے وقف کرنے کی ترغیب دینے کو مذہبی احترام اُس کے ساتھ لگا دیا گیا۔ اس قانون پر عمل کرتے ہوئے بہت سے پرہیزگار مسلمانوں نے پچھلی صدی میں بے شمار بڑے بڑے وقف اس امید سے کئے کہ جائداد بستہ رہے گی اور اُن کے مرنے کے بعد برباد نہ ہوگی۔ لیکن ہماری بدقسمتی تھی کہ پچھلی صدی کے ختم کے قریب پریوی کونسل نے یہ طے کر دیا کہ ایسے وقف جو خاندان اور جانشینوں کے

گزارے کو عمل میں لائے جائیں قانوناً ناجائز ہیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایسے اوقاف کی بہت بڑی تعداد ناجائز قرار دیدی گئی اور وقف کی بڑی بڑی جائدادیں جن میں جماعت کو حقِ تولیت پہونچتا تھا خانگی مالکوں کے قبضہ میں پہونچ گئیں اور اُنھوں نے اُن کو اُڑا دینے میں دیر نہ لگائی۔ اس طرح دو پشتوں سے ہم کو بیرون از قیاس نقصان پہونچا ہی۔ مگر رائٹ آنریبل مسٹر سید امیر علی پریوی کونسلر کی قومی رائے اور زبردست رائے عامہ کا لحاظ کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کا صحیح شرعی قانون منسوخ کیا گیا ہی گورنمنٹ مان گئی اور جواز وقف کا قانون ۱۹۱۳ء پاس کر دیا گیا۔ مسلم جماعت نے اُسکا بڑی خوشی سے خیر مقدم کیا۔ اس قانون کی تمہید کی زبان سے جس سے یہ اشارہ پایا جاتا تھا کہ یہ اعلانی قانون ہی یہ اُمید ہوئی تھی کہ ماضی پر بھی یہ موثر ہوگا اور پُرانے اوقاف کے جواز و صحت میں کوئی شک باقی نہ رہے گا۔ لیکن ہم کو پھر مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ہندوستان کی عدالتوں اور پریوی کونسل کے ججوں نے یہ حکم نافذ کیا کہ اس جدید قانون سے اوقاف ماضیہ کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ۱۹۱۳ء سے پہلے کے ہزاروں وقف ناجائز ہیں۔ اَب یہ اُمید کی حد سے باہر بات ہی کہ آئندہ کسی اور قانون سے وہ ناانصافی جو شرع محمدی کے ساتھ کی گئی ہی دور کی جائے۔

لیکن اس داستان کا سب سے اندوہناک حصہ یہ ہی کہ چونکہ مسلم جماعت کی پچھلے تیس سال سے ایسی اوقاف کی ناجوازی کی عادۃً ہو چکی تھی جبکہ عدم جواز کا قاعدہ جاری تھا۔ ہماری مسلم جماعت خود قانونِ اسلام کو فراموش کر بیٹھی۔ اور عدم وقفیت اور جہالت میں ایسی ڈوب گئی کہ وہ عملی طور سے یہی نہیں جانتی کہ ایسا قانون پھر نافذ ہوگیا ہی جس نے ایسے اوقاف کی اجازت دیدی ہی۔ جب تک عام اور عالمگیر کوشش نہ کی جائے گی لوگوں کو تبدیل قانون کا علم ہونے میں ایک مُدتِ مدید لگ جائے گی۔ جماعت کو یہ بتانے کی بھی ضرورت ہی کہ اُس کو یہ یقین دلایا جائے کہ از روے اسلام ایسا وقف ایک کارِ خیر ہی جو جماعت کی بھلائی اور اُس کو افلاس سے محفوظ رکھنے کے لئے کیا جاتا ہی۔ اس کے لئے ضرورت ہی کہ مساجد کے ممبروں۔ جلسہ گاہوں کے چبوتروں (گو تماشہ گاہوں کے اسٹیجوں سے نہ سہی) ماہوار رسالوں۔ پمفلٹوں۔ اخباروں اور بڑے بڑے اشتہاروں کے ذریعہ سے عام اعلان کیے جائیں تاکہ سب کو وقفِ علی الاولاد کے فائدے معلوم ہوجائیں اور وہ یہ سمجھ جائیں

کہ ایسے وقف اُن کے لئے بڑے نفع اور فائدہ کی بات ہیں۔ وقف ناموں کے مسودات ایک کتاب کی شکل میں چھاپ لئے جائیں کہ جب کوئی ایسا وقف کرنا چاہے تو اُس کو آسانی سے دستیاب ہوجایا کریں۔

وقف ناموں میں پس وپیش اور اکراہ کا ایک سبب بڑی قیمتوں کے اسٹامپ بھی ہیں جو بسا اوقات لگانے پڑتے ہیں۔ بعض صوبوں میں بورڈ مال نے یہ بھی قاعدہ کردیا ہے کہ چونکہ وقف علی الاولاد امانت کا صرف ایک اقرار ہی نہیں ہے جس کے لئے انتہائی پندرہ روپیہ کے اسٹامپ کی ضرورت ہو بلکہ وہ ایک بندوبست اور انتظام ہے اس لئے مالیت موقوفہ کے لحاظ سے قیمت جائداد پر آٹھ آنہ سیکڑہ کے حساب سے زائد اسٹامپ لگایا جائے۔ اس ٹیکس کے لگائے جانے سے بہت لوگ نئے وقف کرنے سے خائف ہوگئے ہیں۔ مگر یہ بتایا جاتا ہے کہ مسلمان وقف کے لئے کسی دستاویز کی حاجت ہی نہیں ہے۔ صرف وقف کا اقرار درکار ہے جس کے ساتھ متولی کے نام ضروری قبضہ کا انتقال ہوجانا چاہیئے۔ پس اگر اقرار کے ساتھ جائز طریقہ سے وقف کردیا اور قبضہ دیدیا جائے اور اس سے وقف کا پورا عملدرآمد ہوجائے تو پھر مابعد ایسی دستاویز جس میں اس پہلے وقف کا صرف بیان ہو کوئی ایسی دستاویز نہ ہوگی جس کے ذریعہ سے وقف کیا جاتا ہے اور وہ وقف کے اقرار کا حکم رکھے گی اور اس کے لئے پندرہ روپیہ کا انتہائی اسٹامپ کافی ہے۔ ایسا طریقِ عمل اختیار کرنا بے ایمانی سے اسٹامپ لگانے سے بچنا نہیں کہا جاسکتا بلکہ اُس طریق کا اختیار کرنا ہے جس کی قانون نے اجازت دی ہے جس سے واقف جائداد کی قیمت کے لحاظ سے اسٹامپ لگانے سے بچ جاتا ہے۔

پچھلے زمانہ میں وقف کی آمدنیاں متولیوں کے خورد بُرد کرلینے سے بڑی مصیبت تھی ہماری انتہائی بے اعتنائی کھلی چشم پوشی کی حد کو پہونچ گئی۔ ۱۹۲۳ء سے مسلمان وقف ایکٹ جاری ہوجانے سے بڑی ضرورت پوری ہوگئی ہے اور توقع ہے کہ اس مصیبت کا علاج ہوجائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض صوبوں میں جہاں اس ایکٹ کا نفاذ ہوگیا ہے۔ آڈیٹروں کے جبر اور تاوانی شرح کی حتی کہ آمدنی پر پانچ فی صدی لے لینے اور بعض ڈسٹرکٹ ججوں کے یہ شرح منظور کردینے کی متواتر شکایت ہے۔ لیکن یہ محض فرعی باتیں ہیں۔ اور مختلف لوکل گورنمنٹوں کے مناسب قواعد بنادینے سے

دو رہو سکتی ہیں۔ چھوٹی آمدنیوں کے اوقاف کے لیئے جن کی آمدنیاں دو ہزار روپیہ سے نیچی ہیں غیر سند یافتہ مسلمان آڈیٹر مثلاً مسلمان جونیر وکلار کافی ہیں اور فیس ڈو روپیہ فی صدی سے کسی حال میں زائد نہونی چاہیئے۔ اگر ایک یا دو شخصوں کا تمام ضلع کے لیئے انتخاب ہو جائے تو پھر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ فیس نامناسب یا کم ہو۔ شاید ایسے شخص کے واسطے یہ فیس کم خیال کی جائے جو اپنا تمام وقت اسی کام میں صرف کرے۔ لیکن ایسے نوجوانوں کے لیئے جو اپنے بچے ہوئے وقت میں یہ کام کریں یہ فیس کم خیال نہیں کی جاسکتی۔

ایک اور بڑی شکایت یہ ہو کہ متولیوں کو ڈسٹرکٹ جج کے دفتر میں بذاتِ خود اپنے حسابات داخل کرنے ہوتے ہیں اور مجاز مختار وغیرہ کی اجازت نہیں ہو۔ یہ ضابطہ قطعی غیر ضروری ہو کیونکہ چھوٹے چھوٹے وقفوں کے متعلق متولیوں کو بسا اوقات بڑے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ چنانچہ از روئے قاعدہ یہ اجازت ہونی چاہیئے کہ باقاعدہ مصدقہ حساب کے کاغذات بذریعہ رجسٹری شدہ لفافہ کے ڈاک سے بھیجدیئے جایا کریں اور یہ کاغذات بطریقِ ضابطہ لیئے جایا کریں۔

اب جبکہ حسابات کا داخل کرنا متولیوں پر لازمی کر دیا گیا ہو تو جماعت کو ہوشیاری کے ساتھ یہ دیکھتے رہنے کی ضرورت ہو کہ کوئی متولی اس جھوٹے عذر سے کہ کوئی وقف نہیں ہو یا وقف خانگی ہو حسابات کو بد دیانتی سے روکتا تو نہیں ہو اور جو حسابات اُس نے داخل کیئے ہیں وہ صحیح اور اصلی ہیں۔ متولیوں کو کسی طریقہ سے پریشان کرنے کا ارادہ نہ کیا جائے لیکن ایسی نگرانی ضرور ہونی چاہیئے کہ اُن کو صحیح حسابات تیار کرنے اور داخل کرنے کی ترغیب ہو۔

یہ بات صحیح طریقہ سے معلوم کر لینے میں کہ آیا فلاں وقف عام ہو یا ذاتی یا جزاً عام ہو اور جزاً ذاتی کوئی عملی دشواری نہیں ہو سکتی۔ جب آمدنی کے متعلق یہ ہدایت ہو کہ وہ عام خیراتی یا عمومیت کے ساتھ مذہبی کاموں میں صرف کی جائے تو ظاہر ہو کہ وہ وقفِ عام ہو۔ اور جہاں یہ ہدایت ہو کہ آمدنی خانگی یا جانشینوں کی پرورش یا خود واقف کی قبر یا اُس کی دعائے مغفرت میں صرف کی جائے۔ اور یہ باتیں کسی بزرگ مشہور ولی کی فاتحہ سے جدا ہیں۔ تو جان لینا چاہیئے کہ وقف صاف طور سے ذاتی ہو۔ اور جہاں مصارف کے متعلق ہدایت مخلوط و مرکب ہو تو وہ وقفِ نیم عام ہو۔ لیکن نیم عام وقف کی حالت میں بھی متولی اس کے پابند ہیں کہ جہاں تک عام مصارف سے

تعلق ہو اُس کا حساب رکھیں اور داخل کریں۔ اگر ہمارے اوقاف کا مناسب طریقہ سے انتظام کیا جائے تو ہمارے پاس کافی سرمایہ ہو سکتا ہے اور کارہائے خیرات اور بڑے پیمانہ پر دینی تعلیم پر صرف ہو سکتا ہے اگر وہ دنیوی تعلیم پر نہ ہو تو نہ سہی۔ تمام اوقاف کی آمدنیاں مناسب طریقہ سے کام میں لائی جائیں تو ہماری مسجدوں اور مدرسوں کو روپیہ کی کمی نہ ہے اور نہ وہ ویران ہوں۔ وقف کا روپیہ عام روپیہ ہے اور یہ دیکھنا جماعت کا فرض ہے کہ یہ روپیہ نامناسب طریقوں پر صرف نہیں ہوتا بلکہ مناسب مقاصد میں لگایا جا رہا ہے۔

قانونِ تمادی

ہندو اور مسلمان دونوں اوقاف کو اس ملک کے قانون کی ایک بدنصیب خصوصیت کی وجہ سے سخت مصیبت کا سامنا ہے اور یہ قانون اُس زمانہ میں وضع کیا گیا جبکہ موقوفہ جائدادوں کی حفاظت و بقا کا حسب دلخواہ لحاظ نہ تھا۔ یہ تو اچھی طرح معلوم ہے کہ موقوفہ جائدادیں متولیوں کی ملکیت نہیں ہوتیں۔ بلکہ یہ جائدادیں اُن کے پاس صرف امانت ہوتی ہیں عقل یہی چاہتی ہے کہ جب متولی اس جائداد کو منتقل کرے تو اُس شخص کا جس کے نام جائداد منتقل کی گئی ہے متولی کے مقابلہ میں قبضۂ مخالفانہ ہوگا نہ کہ خود وقف کے مقابلہ میں لیکن قانون تمادی جیسا آج نافذ ہے وہ مختلف ہے۔ یعنی بارہ برس گزر جانے پر خود وقف برباد ہو جاتا ہے اور جس کے نام موقوفہ جائداد جدا کی گئی تھی وہ اُس جائداد کا صاف مالک بن جاتا ہے۔ چنانچہ اس شخص کی قانون نے بمقابلہ اُس شخص کے زیادہ حفاظت کی ہے جو ایک محدود مالک ہے جس کا فی الوقت جائداد پر مقررہ شرائط کے ساتھ حق قبضہ تھا اپنے نام جائداد منتقل کراتا ہے ایسی حالت میں جبکہ محدود مالک کسی کے نام جائداد منتقل کرتا ہے اس محدود مالک کی وفات تک قبضۂ مخالفانہ کا اجرا شروع نہیں ہوتا۔ عام پبلک سے یہ توقع کس طرح کی جا سکتی ہے کہ جب کبھی امین امانت میں نقضِ عہد کرکے موقوفہ جائداد کا کوئی جزو جدا کرے تو ہر دفعہ یہ عام پبلک مقدمہ دائر کردے۔ چنانچہ راستہ میں بڑی دشواریاں ہیں۔ محنت اور صرف کو تو بالائے طاق رکھیئے نالش میں کامیابی کا یقین کب ہوتا ہے۔ پس با اثر متولی کے مقابلہ میں کوئی نہیں آتا۔ متولی جب برخاستگی کو برسرِ رسیدہ دیکھتا ہے تو اس خوف سے وہ یقیناً اُسی شخص کا حامی بن جاتا ہے جس کے نام اُس نے موقوفہ جائداد کا جزو منتقل کیا تھا۔ خاص وہ شخص جس کا یہ فرض ہے کہ وقف کے جزوِ منتقل شدہ کی بازیافت کی نالش

دائر کرے وہ ہوتا ہی جو موجودہ متولی کا جانشین ہو۔ یہ جانشین اکثر اس متولی کا بیٹا یا وارث ہوتا ہی لہذا ایسے جانشین کے پاس نہ تو روپیے ہی ہوتے ہیں نہ اُس میں اتنی جرأت ہی ہوتی ہی کہ اپنے پیش رو کے جائداد جدا کر دینے کے فعل کے مقابلہ میں خم ٹھونکے۔ اگر یہ متولی جس نے جائداد کا جزو جدا کر دیا تھا بارہ برس اور زندہ رہتا ہی تو اُس کے جانشین کے حق میں نالش کا حق پیدا ہونے سے بہت پہلے تمادی عارض ہو جاتی ہی۔ پس ایسا قانون از روئے اصول نہ حمایت کے قابل ہی نہ باقی رہنے کے لائق ہی اور عملاً وہ نہایت برباد کن ہی۔ اگر ایسے اعداد کے نقشے دستیاب ہو سکتے جن سے یہ انکشاف ہوتا کہ ہمارے ہی متولیوں کی بدچلنی اور قانونِ تمادی کی بدولت جو اوقاف کو نقصان پہونچا کر مشنریوں کی مدد کرتا ہی ہماری جماعت کے ہاتھ سے کس قدر قیمتی موقوفہ جائدادیں نکل چکی ہیں تو اس سے لوگ چونک پڑتے۔

مہاجنوں کا قانون

چونکہ یہ واقعہ ہی کہ روپیہ کے لین دین کا کام قطعی ہندو جماعت کے ہاتھوں میں ہی اور مدیونوں کی جماعتِ غالب مسلمان ہیں۔ پس ان مہاجنوں کو کسی قدر قابو میں لانے کو اگر کوئی تدبیر عمل میں لائی جائے تو وہ تدبیر اِسی نظر سے دیکھی جاتی ہی کہ فرقہ بندی کی تجویز ہی اور اُس کے مقابلہ میں ایک طوفان برپا کر دیا جاتا ہی مگر چونکہ زمانہ ترقی کر رہا ہی اور فرقہ بندی کی تلخی کا احساس گھٹ رہا ہی اب یہ واقفیت معلوم ہونے لگے گی کہ اِس قسم کی تجویزیں سب کی بھلائی کے واسطے ہیں اور اُن سے ہندو زمینداروں۔ کاشتکاروں اور نیز کاروباریوں کو جو اونچی شرح سود کی وجہ سے جس کا ملک میں رواج ہو رہا ہی دیئے جا رہے ہیں نفع پہونچے گا۔ بھلا کیونکر سنجیدگی سے یہ خیال کیا جا سکتا ہی کہ کاروبار اور صنعت و حرفت کو سرسبزی نصیب ہوگی جبکہ سرمایہ جو اصل جان ہی بدون تاوانی شرح سود کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اب یہ دیکھنے کی بات اور ہی کہ جب اس شدت سے سود ہی دینا پڑا تو منافع میں کیا خاک بچا۔ اور ایسی صورت میں کسی کام کا سرسبز ہونا غیر ممکن ہی۔

انتقالِ اراضی کا قانون

بعض مقامات پر جہاں زمیندار طبقہ کے لوگ مفلسی میں مزمن طریقہ سے غرق پائے گئے تھے انتقالِ اراضی کا قانون نافذ کر کے گورنمنٹ نے کچھ دادرسی کی تدبیر کر دی ہی۔ خاصکر یہ پنجاب اور

بندیل کھنڈ میں ہی لیکن ضرورت زمانہ اب ایسی عالمگیر ہوگئی ہی کہ ایسا قانون تمام ہندوستان میں
جاری کیا جائے کیونکہ سوائے اُن رقبات کے جہاں دوامی بندوبست ہی تمام ہندوستان میں
زمینداروں کی یکساں حالت ہی۔ وہ خود اپنی بدنظمی اور فضولخرچی کا شکار ہو رہے ہیں اگر براہ راست
قانون سے مدد نہ ملی تو اپنے تئیں بچا نہیں سکتے۔ اب تک جیسی انتقالِ جائداد کے متعلق اُن کی قوت
بے قید ہی اگر اُس میں ایک دفعہ لگا دی گئی تو اُن کی بے باکی کی طرف سے حفاظت ہو جائے گی
اور اُن کی اولاد کو بربادی سے امن مل جائے گی ایسے زراعتی ملک میں جیسا ہندوستان ہی اور
جہاں زمین ہی پر لوگوں کا گزارہ ہی اگر وہ زمین سے یکایک محروم ہو جاتے ہیں تو کسی ویسی دستکاری
سے وہ اپنی روزی حاصل نہیں کر سکتے بلکہ بیکار رہتے ہیں اس لئے گورنمنٹ کا فرض ہی کہ اُن کو
فاقہ کشی سے جو خود اُن کی فضولخرچی کا نتیجہ ہوتی ہی بچائے۔

آراضی رہن رکھنے والے بنک

شرح سود کے زیادہ بڑھ جانے کا ایک سبب یہ بھی ہی کہ بہت سے ممتاز بینک غیر منقولہ
جائداد کو رہن رکھ کر روپیہ قرض نہیں دیتے۔ اُن کا ماحول بلا شبہ یہ خوف ہوتا ہی کہ روپیہ کے
وصول کا جب وقت آئے گا تو غالبًا طویل نالشوں کے جھگڑے میں پڑنا ہوگا جن میں مدیون جوابدہی
کرینگے۔ بس ایسے لوگ جو گورنمنٹ کی ضمانتوں والے نوٹوں سے روپیہ قرض نہیں لے سکتے خانگی
مہاجنوں کے پنجہ میں بمجبوری پڑ جاتے ہیں اور یہ مہاجن مقدمہ بازی کے خطرات کے واسطے
تیار ہو کر کڑی شرح سود پر روپیہ قرض دیتے ہیں۔ اگر ایسے بینک قایم کر دیئے جائیں جو زمینداروں
اور مکانات کے مالکوں کو آراضی رہن جائداد رکھ کر قرض سے اُن کی مدد کریں تو ضرورت اور مصیبت
میں ایسے قرض لینے والوں کو بڑی نجات مل جائے۔ کوئی شک نہیں کہ دیہاتی رقبوں میں کواپریٹو بنک
قایم کئے جا رہے ہیں لیکن وہ بہت سُست رفتاری سے ہر دل عزیزی حاصل کر رہے ہیں کیونکہ اُن کی
طرف سے کسی قدر بے اعتباری اس لئے پیدا ہوگئی ہی کہ بعض بینکوں کے مہتمموں نے کبھی کبھی سخت
اور بے ایمانی کا برتاؤ کیا ہی۔ لیکن ایسے بینکوں کے انتظام اور منتظم افسروں کی زیادہ سخت
نگرانی ہونے سے حالت جلد اصلاح پر آ جائے گی۔

اتحادِ عمل کی انجمنیں

ہندوستان میں تحریک اتحادِ عمل کا ابھی آغاز ہے۔ دیہاتی رقبات کا تو مذکور ہی کیا ہے شہروں اور قصبات تک میں اتحادِ عمل کی انجمنیں ابھی چند اور ایک دوسرے سے بڑے فاصلوں پر ہیں۔ ایسی انجمنوں کا تمام مقصد یہ ہے کہ کسی پیشہ یا حرفت کے افراد کی انجمنیں اس غرض سے ترتیب دیں کہ وہ پیشہ یا حرفت قطعی اپنی ذاتی کوشش سے جاری کرکے منافع کا بڑا حصہ اپنے واسطے حاصل کریں۔ ایسی انجمنوں کا بننا اس بات پر منحصر ہے کہ متحدہ ارادے کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مقصد مشترک قایم کیا جائے۔ لیکن ایسے عمل اور ایسی خواہش کی کمی ہے کیونکہ کاریگر اور مزدوری پیشہ لوگوں کا بڑا گروہ جاہل اور ناخواندہ ہے۔

یہ اصلیت بھی ابھی محسوس نہیں کی گئی ہے کہ اتحادِ عمل کے اصول قایم کرنے ضروری ہیں جیسا کہ تقسیم کرنے والی انجمنوں کا مقصد تھا کہ انجمن کے اراکین کو اور نیز بعض اوقات دوسرے عام لوگوں کو ضروریاتِ خانہ داری اور دوسری اشیا دی جائیں۔ یہ کام اس اصول پر چلایا جاتا ہے کہ اراکین کی خریداری کی نسبت سے اس سرمایہ پر جو اراکین نے بطور چندہ کے دیا تھا ایک مقررہ فی صدی سود منہا کر لینے کے بعد بچا ہوا منافعہ صرف اراکین کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں بھی جبکہ یہ انجمنیں پیدا کرنا اور بڑے پیمانہ پر مال تیار کرنا جاری نہ رکھ سکیں تب بھی ایسی انجمنیں بنائی جا سکتی ہیں جو تجارتی آڑھتوں کے طریق پر دساور سے اکٹھا مال منگانے اور تھوک فروشی کا کام دے سکتی ہیں۔ ایسی انجمنوں کی انواع و اقسام کی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مالی کاروبار کی۔ آراضی کی۔ قرضہ دینے کی۔ اور دستکاری کی انجمنیں ہو سکتی ہیں۔ تمدنی اور اقتصادی دونوں حالتوں سے اتحادِ عمل بڑا کثیر نفع دے گا۔ لوگوں کو روپیہ اور سامان دینے، دستکاری اور فروخت کے عملی طریقے اختیار کرنے اور ملک کے ایک حصہ میں دوسرے حصوں کی کارروائیوں سے دلچسپی پیدا کرانے سے مزدوری پیشہ لوگوں کو بیحد نفع پہونچانے اور زرعی اتحادِ عمل کو نشوونما دینے کا ایک راستہ نکل آئے گا اور زمینداروں اور کاشتکاروں کے لئے ایک نعمت ہوگا۔

قانون تعزیرات اور جیلخانے

سب سے پہلی ہندوستانی قانونی کمیشن کے ماتحت جس کے صدر مسٹر میکالے تھے جو بعد کو لارڈ میکالے ہوئے ۱۸۳۷ء میں تعزیرات ہند کا مسودہ بنا اور پھر خفیف ترمیم کے بعد ۱۸۶۰ء میں قانون ہو گیا۔ اُس وقت سے ابتک خیالات میں عظیم الشان انقلاب ہو گیا ہے اور جرم وسزا کے تخیل میں حیرت انگیز تبدیلی ہو گئی ہے اٹلی کے اسکول تحقیقات جرائم نے جس کے رہنما سی سیزر لیمبروسو۔ اور اُس کے اصول کے پیرو اشخاص فرانس۔ جرمنی۔ انگلینڈ اور امریکا والے تھے ایسے اعداد نقشہ جات جمع کیے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ میلانِ جرم جس قدر وراثت کا نتیجہ ہے اُس قدر ماحول کا نتیجہ نہیں ہے۔ ارث بلاواسطہ سبب پایا گیا ہے اور یہی خاص جسمانی اور دماغی وجہ مجرمانہ میلان کی ہے جو وراثتاً منتقل ہوتی ہے۔ عادی مجرموں اور پاگلوں کے باہم بہت کچھ مشابہت کا سراغ چلا ہے۔ یہ رائے نوار تقاءِ حیوانیتِ انسان سے تعلق رکھتی ہے لیکن معاشرت کا نظریہ ہے کہ ایک مجرم سے اس طرح برتاؤ کیا جائے کہ وہ صرف حالات کا شکار رہا ہے۔ دونوں حالتوں میں اب سزا کا منشا انتقام نہیں ہے بلکہ اصلاح ہے کسی مجرم کو صرف اسی لیے سزا نہیں دیجاتی کہ اُس نے کیا فعل کیا تھا بلکہ وہ محبوس رکھا جاتا ہے کہ جس جماعت کے قانون سے اُس نے انحراف کیا تھا اُس جماعت سے کچھ عرصہ کے واسطے وہ علحدہ کر دیا جائے اور اپنی بدچلنی سے تائب ہونے کی اُس کو تربیت ہو چنانچہ مقصد انتقام نہیں ہے بلکہ اصلاح ہے۔ منشا یہ ہے کہ مجرم اپنی پہلی حالت پر واپس آئے۔ سزا کی ایک خاص مقدار اُس کی روح کو پاک کرے گی اور اپنی حالت میں اصلاح کرنے کا عزم پیدا ہوگا۔ لیکن قید سے رہا ہونے کے بعد اُس کی اصل اصلاح بہت کچھ اُس سلوک پر منحصر ہے جو اُس کے ساتھ وہ جماعت کرتی ہے جس کی اُس نے قانون شکنی کی تھی۔ اگر جماعت اُس کو اپنے میں ملانے کو آمادہ ہو۔ اُس کے ساتھ ہمدردی کرے اور اُس کو معاف کر دینے کو تیار ہو بہ شرطیکہ وہ نیک چلنی سے رہے تو اس شخص کے ایماندارانہ زندگی بسر کرنے کے حقیقت میں بڑے موقعہ ہیں۔ لیکن جماعت کا یہ حال ہے کہ اُس کو ایسی حقارت سے دیکھتی ہے جیسے پنچایت باہر شخص دیکھا جاتا ہے۔ اگر جماعت اپنی برکات اُس شخص تک وسیع نہ کرے گی۔ اور اُس کی خطائیں بھول کر اور معاف کر کے کھُلے آغوش سے اس کو اپنا نہ بنائے گی تو حقیقت میں

اس شخص کی قسمت بہت افسوسناک ہوگی۔ بالآخر وہ اُنھیں ناممکن الاصلاح مجرموں کی صحبت تلاش کرنے پر مجبور رہوگا اور اُنھیں کے قدم بہ قدم چلے گا جن کے دل کے دل موجود ہیں اس طرح وہ جرائم کے سمندر میں غرق ہوتا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ تھوڑے عرصہ کی قید ایک نوجوان کے دیہ پر مضر اثر کرتی ہی یعنی جیلخانہ میں بدچلن لوگوں کی صحبت میں رہنے پر وہ مجبور رہوتا ہی اور اگر جیل سے نکلنے کے بعد جماعت نے اُس سے گھن اور نفرت کی تو ضرور بالضرور وہ بدچلن ہوجائے گا۔ پس یہ لازم ہی کہ ہم اُس کو اصلاح کا موقعہ دیں اور اگر یہ رہا شُدہ مجرم اپنی اصلاح کا ثبوت دے تو کوئی معقول وجہ نہیں کہ وہ معاف نہ کردیا جائے۔ خصوصاً جبکہ اُس کو اُس کے جرم کی سزا ل چکی۔ ایسے آدمیوں کے ساتھ جن کی فطرت جرم نہ ہو بلکہ موجودہ حالات کے دام کا شکار ہوگئے ہوں رحم اور ہمدردی کا طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے۔

اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ جیل خانے اور محبس اصلاحی مرکز بنیں تو اُن کی حالتوں میں بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہی۔ اُن میں کثرت سے صاف ہوا ہونی چاہیئے۔ روشنی ہونی چاہیئے اور مضر صحت حدود کی جگہ قیدیوں کو آزادی دیجائے۔ عادی مجرموں کو چھوڑ کر دوسروں کو قید تنہائی کی سزا دینے سے کہاں تک مفید نتیجہ نکلتا ہی یہ ایک سوال ہی۔ بظاہر اس کا میلان و نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہی کہ روحانی اور دماغی حالت کو انحطاط ہو۔ لیکن عموماً مجرموں کی دماغی حالت غیر نشوونما یافتہ ہوتی ہی پس اگر سلیقہ سے کام نہ لیا جائے تو احتمال ہی کہ یہ دماغی حالت ایسی ہوجائے کہ اُس کی اصلاح ہو ہی نہ سکے۔ چنانچہ مجرموں کے ساتھ لحاظ کا برتاؤ ہونا چاہیئے اور اُن کو یہ محسوس کرایا جائے کہ ایماندار شہری بن جانے کی تربیت کی غرض سے یہ قید ایک کفارے کی حیثیت ہی جو اُنھیں برداشت کرنی پڑی ہی۔

معاشرتی انجمنیں

ہم کو ایک باقاعدہ دستور بنانا چاہیئے کہ سال میں صیغۂ اصلاح تمدن کے باقاعدہ اجلاس منعقد کیا کریں یہ کانفرنسیں صوبہ وار ایک دفعہ سے زیادہ اور ضلع وار اور بھی زیادہ ہوا کریں۔ یہ دستور بڑے پیمانہ پر بنایا جائے۔ اُس کی اساس مستحکم ہو اور جہاں تک ممکن ہو وہ محیط ہو۔ اصل کام کرنے والوں میں سب کے لئے رکنیت کھلی ہو جن کو اصلاح تمدن کے کام میں دلچسپی ہو۔ اور سب ایسے سرگرم رضاکار جو اپنا وقت اور محنت دینے کو آمادہ ہوں جس سے اصلاح تمدن کی ترقی ہو شریک کیئے جائیں۔ اراکین اور

ڈیلیگیٹوں کی صلاحیت جو کانفرنس میں شریک ہوں۔ چندے اور فیس کی مقدار اگر کچھ مقرر کی جائے جو ادا کرنی پڑے یہ سب باتیں احتیاط کے ساتھ قلمبند کر دی جائیں۔

آل انڈیا تمدنی کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقد کرنا بہت اچھی بات ہے اور اپنے طریقہ سے وہ مقصد کو پورا کریں گے۔ لیکن جو ریزولیوشن اِن کانفرنسوں میں پاس ہوتے ہیں اُن کا اثر نہایت محدود تعداد کے افراد تک پہونچتا ہے اور یہ ریزولیوشن ناخواندہ گروہوں تک نہیں پہونچتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے موقعوں پر جو کوششیں کی جایا کرتی ہیں اُن کا نتیجہ عملی اُن کوششوں کے تناسب سے قطعی کم ہوتا ہے۔ پس اگر علاوہ آل انڈیا کانفرنس کے ہم صرف صوبہ وار کانفرنسیں ہی نہ قایم کریں بلکہ اضلاع میں بھی اُن کو منعقد کریں تو آبادی کے بڑے حصہ تک اُن کا اثر پہونچے گا اور جو پیغام ہم پہونچانا چاہتے ہیں وہ لوگوں کو پہنچ جائے گا۔ اضلاع کے کام سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ آل انڈیا یا صوبہ کی کانفرنس تو آسانی کے ساتھ سال میں صرف ایک ہی دفعہ منعقد ہو سکے گی لیکن ضلع کی کانفرنسیں بار بار منعقد ہو کر تمدنی کام برابر سال بھر جاری رکھینگی۔ اُن کی کوششوں کا دائرہ چھوٹے رقبہ تک محدود ہوگا پس ہر ایک امکان ہے کہ مقامی باشندے کار اصلاح میں بڑی حد تک زیادہ دلچسپی کا اظہار کریں۔ اِن کانفرنسوں کے فوائد لوگوں کی نظروں کے سامنے ہونگے اور وہ اپنی آنکھوں سے جو کام ہو رہا ہوگا اُس کو دیکھینگے اور اُن کو معلوم ہوگا کہ کیسے کیسے فوائد ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ اضلاع میں کانفرنسیں زیادہ تعداد سے ہونگی تو نہایت قابلِ ستایش باہمی رقابت بھی پیدا ہو کر یہ حوصلہ بڑھے گا کہ ایک دوسرے پر سبقت لیجائے۔ ہر ایک دوسرے کی نظیر سے فائدہ اُٹھائے گا اور خود اُس کی یہ حالت ہو جائے گی کہ کسی خاص معاملے میں پیش پیش وہی ہو۔ پس اُمید کی جاتی ہے کہ اس مدراس کی کانفرنس ہو جانے پر سال نو کے آغاز سے اضلاع کی کانفرنسیں شروع کر دی جائیں گی۔ اور اس کانفرنس میں جو ریزولیوشن پاس ہوں گے اُنھیں کے طریقہ پر ضلع میں جدا جدا کام ہونے لگے گا۔ ہر ضلع میں ایسے نوجوانوں کے گروہ جمع کرنے چاہییں جو سرگرم۔ اپنے یقین میں مخلص۔ کام میں جوش والے اور افعال میں دھنی ہوں اور پھر یہ نوجوان اپنے ناخواندہ غریب بھائیوں میں اچھی طرح غور کیا اور تجویز کیا ہوا نظام العمل عمل میں لائیں۔ اور جب دوسرے سال کانفرنس میں ہم جمع ہوں تو ہر ضلع اپنے شاندار کام کو جو سال میں اُس نے کیا ہو پیش کرنے کے لایق ہو۔

معاشرتی مجالس کے کارکن

اضلاع میں گاہے ماہے کانفرنسیں کر لینے سے بھی پورا مدعا حاصل نہ ہوگا۔ جس کی اشد ضرورت ہے وہ یہ بات ہے کہ ہر ایک شہر اور قصبہ میں تھوڑے سے نوجوانوں کی ایسی جماعتیں قائم کی جائیں جو تمدنی خدمات بجا لائیں۔ یہ نوجوان جوش و ہمت سے بھرے ہوں۔ جاں نثاری کا شریف خیال اور اپنی ذات کو فراموش کر دینا ان کی صفت ہو اور یہ نوجوان اپنے ملک و جماعت کو ترقی دینے کے لئے سرگرمی سے آمادہ ہوں اور بلا معاوضہ اپنی خدمات پیش کریں۔ مغرب کی بوائے اسکوٹ اور گرل گائڈ موومنٹس (Boy scouts and girl guide movements) (لڑکوں اور لڑکیوں کی تحریکات) ابتدا ہی میں نوعمروں کو ایسی تربیت دیتے ہیں کہ وہ حاجتمندوں اور مصیبت زدوں کو مدد دینا سیکھ جائیں اور اُن کو اپنی کسی قدر نفس کُشی اور جسمانی تکلیف کی پروا نہ ہو۔ اسی طرح ہند و سیوا سمیتی کی شاندار جماعتیں تمام ہندوستان میں نہایت عمدہ خدمات بجا لا رہی ہیں اور اُن کی حق بجانب تعریف و تحسین کی جا رہی ہے۔ لیکن بوائے اسکاؤٹ اور سیوا سمتی کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہوتے ہوئے ہماری شومی طالع یہ ہے کہ ہم ابتک تمدنی خدمات کی جماعتیں قایم کرنے کے لائق نہیں ہوئے ہیں۔ مولٰنا سعدی جیسے اخلاقی شاعر کا مقولہ ہم بھول گئے ہیں، جو فرماتے ہیں۔

عبادت۔ بجز خدمتِ خلق۔ نیست
بہ تسبیح و سجّادہ و دَلق نیست

یا تو ہمارے درمیان ایسے نوجوانوں کا جو ذاتی تکلیف اُٹھا کر کام کرنے پر مستعد ہوں شاید کال ہے یا یہ ہو کہ ایسے بوڑھوں کا قحط ہے جو اب روپیہ پیدا کرنے کے پیشوں سے کنارہ کش ہوئے ہوں۔ اور اُن کے پس انداز نے روپیہ کی ضرورت سے اُن کو مستغنی کر دیا ہو اور وہ اصلاحِ تمدن کے معاملہ میں اپنا پورا وقت صرف کرنے کو تیار ہوں ۔ یا ہم یہ اُمید کریں کہ ایسے لائق جوان اور بوڑھے ہم کو دستیاب ہو سکتے ہیں جنھوں نے ابھی تک صرف اس لئے پیش قدمی نہیں کی ہے کہ ابھی کام کی بسم اللہ نہیں کی گئی ہے اگر ایسے رضاکار ہمارے گلی کوچوں میں غریب درجہ کے لوگوں کے درمیان کام

کرنے لگیں اور جاہلوں اور ناخواندہ لوگوں کو صفائی۔ اچھی عادتیں۔ اعلیٰ اخلاق۔ صاف ستھرے خانہ داری کے معاملات اور حفظانِ صحت کی شکلیں صراحت کے ساتھ بتائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ابتدائی تعلیم بھی شامل ہو۔ تو موجودہ رفتار سے جو ترقی پچاس برس میں بھی نہیں ہوسکتی وہ ترقی تھوڑے ہی زمانہ میں حاصل ہوسکتی ہے۔

ہمارے نوجوان انڈر گریجویٹ بھی اگر یہ محسوس کریں کہ کچھ تمدنی خدمات بجالانا اُن کا فرض ہے تو بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ اس سے صرف اُن کی جماعت ہی کو نفع نہ ہوگا بلکہ یہ اُن کی اپنی تہذیب اور ادب آموزی کا بھی ایک ذریعہ ہوگا۔ اگر ہفتہ میں نہ سہی مہینہ میں انڈر گریجوئیٹوں کی جماعتیں صرف دو دو گھنٹے کو غریب اور جاہل لوگوں کے درمیان گلی کوچوں میں نکل کر ان نادانوں کو صاف ہوا کے ابتدائی قواعد بتائیں۔ اُن کو صفائی کی عادتیں سکھائیں اور اُن کو ترغیب دیں کہ اپنے گھروں میں حفظانِ صحت کی حالتوں کی اصلاح کریں اور اُن کے بچوں کو ابتدائی مدارس میں بھیجیں تو بہت کچھ ٹھوس کام ہوسکتا ہے۔ تمام ملک میں متحدہ کوشش سے اس کام کو جاری کرنا نہایت پائدار اثر کرے گا۔ پھر جلد ترقی ہونا یقینی بات ہے اور اسی ترقی کی بڑی تمنا ہے۔

زمانۂ موجودہ میں اصلاح تمدن کی شدید ضرورت ہے اور عام تعلیم کے دوش بدوش وہ جاری ہو جانی چاہیئے۔ اس کام کی تکمیل کے واسطے ہم کو ہر جگہ تمدنی جماعتیں قایم کرنی چاہئیں اور بڑے پیمانہ پر معاشرتی پروپیگنڈے کی جدوجہد ضروری ہے۔ اس کے واسطے جمہور کام کرنے والے اور مستعد رضاکار مطلوب ہیں بدون جن کے نہ ایسی انجمنیں قایم ہوسکتی ہیں نہ اُن میں کامیابی ہوسکتی ہے۔

لیڈری (قوم کی رہنمائی)

جمہور کی مدد اور ہمت افزائی سے رہنمائے قوم پیدا ہوا کرتا ہے۔ اگر جمہور ایک اعلیٰ دماغ والے شخص کو رہنما تسلیم کرنے اور اُس کی ہدایتوں کو ماننے کے لیئے تیار ہو جائیں تو کبھی رہنمایانِ قوم کی کمی نہیں ہوسکتی۔ قومی رہنمائی میں اگر مطلق العنانی بھی ہو تب بھی اُس میں بھلائی ہے کیونکہ اُس سے ایک باترتیب باقاعدہ متبعین کا گروہ بن جاتا ہے پس جمہور کی رہنمائی کے لیئے ایک اعلےٰ شخصیت ضروری ہے رہنمائے قوم کسی نفع کی پیروی کی طرف جمہور کو لیجا سکتا ہے اور یہ نفع بدون رہنمائی کے تلاش کرنا دُشوار ہے۔ یہ بدیہی بات ہے کہ رہنمائے قوم کا تسلیم کر لیا جانا ماتحتی کو اپنے اندر مضمر رکھتا ہے پس یہ ضروری

کہ رہنما جیسا حکم دینے کو آمادہ ہو مستعدی کے ساتھ اُس کی فرماں برداری کی جائے۔ لیکن اگر ایک جماعت یا اُس کے کسی جزو کا رہنما کوئی مسلمہ رہنمائے قوم ہوتا ہے تو اُس کی قوت اُسی طرح بڑھ جاتی ہے جیسے ایک ہی فوجی افسر کے ماتحت قواعد داں فوج کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ تکبّر اور غرور، ہنگامہ آرائی، کام کے ساتھ متحد نہیں ہو سکتے۔ عام ہدایت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ عام خیال اور پیروی میں اتحاد پیدا ہو جاتا ہے۔

ہندوؤں کی رزمیہ نظم کی کتابوں مہابھارت اور رامائن نے ہندوؤں کو اپنے سورماؤں کی پرستش سکھائی حتیٰ کہ وہ اپنے سورماؤں کو دیوتا ماننے لگے۔ اپنے مذہبی خیالات اور افتادِ طبیعت ہی کی وجہ سے ہندوؤں نے زبردست اور عظیم الشان چیزوں کو پوجا ہے۔ اُن میں زبردست شخصیتوں کی پیروی اور اُن کے مشورے سے رہنمائی کیا جانا ایک فطرتی میلان رہا ہے۔ پس کوئی تعجب کا مقام نہیں ہے کہ اُنکی جماعت نے ہر زمانہ میں ایسے بے شمار رہنمایانِ قوم پیدا کیے جن کو اپنے پیرو پانے میں کبھی دشواری نہیں ہوئی ہے۔

اِس کے برخلاف مسلمانوں میں ایک خودسری روح پیوست رہی ہے اور مساوات اور اخوت کی تخئیل کا سر سے نکال دینا اِن مسلمانوں کو دشوار رہا ہے۔ چونکہ اسلام کو دعویٰ ہے کہ وہ عالمگیر مذہب ہے اس لیئے اُس میں جمہوریت ہے۔ اگرچہ صدیوں مشرقی ظلم و خودسری کا دَور رہا لیکن حضور سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلے خلفا کی سادہ اور نمایش سے مُبرّا زندگیوں کی روایتیں صدی بصدی نقل ہوتی ہوئی ہم تک آئی ہیں۔ پس ہم میں باہم ایک ایسا احساس ہے جس کو ہم سمجھتے بھی نہیں کہ ہم کسی کو جو رہنمائے قوم بننے کا مستحق ہو اور قطعی فرماں برداری کا حکم دے سکتا ہو اپنے سے بڑا اور برتر مان لیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے درمیان ایسے مُسلّمہ رہنمایانِ قوم کی قابلِ افسوس کمی رہی ہے جن کی بات بے چون وچرا مان لی جاتی اور جن کی نصیحت و مشورے پر بدون اختلاف و شکایت عمل کیا جاتا۔ ہمارا دماغ ہی کچھ ایسا ہے کہ سوائے خدا کی عظمت تسلیم کرنے کے وہ کسی کی بڑائی نہیں مانتا۔ اسی لیئے یہ اصلیت جاننے میں ہم ناکام رہے ہیں کہ مسلم انبوہِ عوام کبھی صحیح ذہنی تکمیل تک نہیں پہونچ سکتے اور دُنیاوی معاملات میں اُن کو اعلیٰ شخصیتوں کی ہدایت کے ماتحت رکھنے کی ضرورت ہے۔

صرف ایسے بڑے قومی رہنما جیسے مغفور سر سید احمد خاں تھے خیالات میں انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔ جماعت کے حالات کی اِصلاح اور قوم کو قطعی خوابِ غفلت سے بیدار کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی

زیرک رہنما، اپنے سلیقہ سے خوفناک خروش کو دفع کرکے جماعت کو بربادی سے بچا سکتے ہیں۔
میری تو یہ آرزو ہی کہ کسی اصلاح کردہ شکل میں سورماؤں کی پرستش کا خیال ہم کو بھی پیدا ہو جاتا تاکہ باوثوق رہنماؤں کی پیروی کے ہم بھی خوگر ہو جاتے۔

لیکن رہنماؤں کا بھی ایک فرض یہ ہی کہ وہ ایک دوسرے سے متحد ہوکر ایک مشورے کے ساتھ مناسب سمت میں رہنمائی کریں۔ اگر ہمارے رہنماؤں میں برابر رائے کا اختلاف اور باہم جھگڑے اور بحثیں ہوتی رہیں تو پھر قوم پر اس بات کا الزام نہیں لگا سکتے کہ وہ رہنماؤں کی ایک دوسرے سے مخالف ہدایتوں کے ماننے سے انکار کرتی ہی۔ اسی وجہ سے ایجوکیشنل کانفرنس اور اصلاح تمدن کی کانفرنس کی طرح انجمنیں قایم کی جائیں تاکہ متحدہ آواز کے ساتھ اشد ضروری اصلاحوں کی ضرورت اور اُن کو عمل میں لانے کے طریقے قوم کے سامنے پیش کیئے جائیں اور وہ اپنی متفقہ سفارشوں سے اہم بنائی جائیں۔

انتخابِ ممبری کے بعد کے اثرات

مختلف حلقوں کے درمیان تفریق اور فرقہ بندی کا بڑا سبب وہ انتخاب بھی ہو رہا ہی جو گورنمنٹ آف انڈیا کے ایکٹ سے جاری ہوا ہی۔ خوش قسمتی سے انتخاب جداگانہ کا قانون ہی اس لیئے ہندوستان کی مختلف جماعتوں کے درمیان شکر رنجی اور شکایت کا موقعہ نہیں رہا ہی۔ اس طریقۂ انتخاب جداگانہ نے جماعتی عداوت روک دی ہی اور کم سے کم خطرہ کا ایک سرچشمہ بند کردیا ہی لیکن ہر جماعت میں ایسے فریق موجود ہیں جن کی رہنمائی رقیب لیڈر کرتے ہیں اور چونکہ کسی فریق کے سیاسی نقطۂ خیال کے لحاظ سے ووٹ (رائے) نہیں دیئے جاتے بلکہ اُمیدواران ممبری کی وجاہت کے خیال پر دیئے جاتے ہیں لہذا فریق بندی کے احساس انتخاب ہی کے دوران تک محدود نہیں رہتے اور نہ اُسی وقت تک باقی رہتے ہیں جبکہ انتخاب کی منسوخی کے واسطے اپیل ہوتے ہیں بلکہ متواتر یہ احساس دوسرے انتخاب تک باقی رہتے ہیں۔ اس کے افسوسناک نتائج ہمارے تمدنی برتاؤ میل جول اور معاملات پر بُرا اثر کرتے اور بہت سی قدیم دوستیوں کا خاتمہ کردیتے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ زمانہ تک عداوت و کاوش قایم رہتی ہی جبکہ ہونا چاہیئے کہ انتخاب کے نتیجہ کا اعلان ہوتے ہی وہ ختم ہوجائے چنانچہ ہم کو یہ عادۃ پیدا کرنی چاہیئے کہ محاربۂ انتخاب کو فوری گزر جانے والی سیاسی

تحریک اور صورت کی تبدیلی سمجھیں۔ جیسے ہی یہ طوفان فرو ہو ہم کو اپنی اصلی حالت پر آجانا اور اپنے سابقہ اچھے تعلقات کی طرف عود کرنا چاہیئے۔

جماعتوں کے باہمی تعلقات

تاریخ کے غمناک واقعات میں سے یہ سب سے زیادہ غمناک واقعہ ہے کہ باوجودیکہ ہندو اور مسلمان صدیوں سے ایک ملک میں رہے ہیں تب بھی شدید اختلافِ مذہبی باقی ہے جس نے ہندوستان کی دو بڑی جماعتوں کے خوشگوار تعلقات کی ترقی کو روک دیا ہے۔ نہایت سخت دشمنی اور تلخ عناد و فساد موجود ہے جبکہ چاہیئے یہ تھا کہ اتحادِ عمل اور نیک ارادے کی ترقی ہوئی یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ وہی لوگ جو سال کے بڑے حصّہ میں باہم میل جول رکھتے اور ایک دوسرے کے ساتھ کاروبار کرتے ہیں کس طرح آنِ واحد میں نفرت۔ جذبات اور غصہ کے خروش سے مشتعل ہوکر دشمن بنجاتے اور ایک دوسرے پر حملہ کر دیتے ہیں اور یہ کسی ذاتی ضرر رسانی کے انتقام کے مدعا سے نہیں بلکہ صرف تعصبِ مذاہبی کے احساس سے کیا جاتا ہے۔

صرف ایک ہی جماعت پر سارا الزام لگانے کی کوشش کرنا بیکار ہے۔ ایسی افسوسناک حالت کی کم و بیش دونوں جماعتیں برابر ذمہ دار ہیں۔ چھوٹی جماعت کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا بڑی جماعت سے بے اعتمادی اور شک کرنے اور زیادہ حقوق و مراعات حاصل کرنے کو تردد آمیز جھگڑا کرنے کیلئے اس کے پاس حق بجانب وجوہ ہیں یا نہیں۔ اور آیا اپنے حق اور جائز حصہ سے اُن فائدوں میں جو تقسیم ہونے کو ہیں اُس کی طلب زیادہ تو نہیں ہے۔ اس کے برخلاف بڑی جماعت کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ محض خیالی نہیں بلکہ عملی طریقہ سے یہ خود اس کا فعل تو نہیں ہے جس سے یہ بے اعتمادی اور آئندہ کو اس سے زیادہ بُرے سلوک کا اندیشہ پیدا ہوا ہے جو چھوٹی جماعتوں کے دلوں میں بھر گیا ہے۔ اس سے کوئی اچھا مُدعا بر نہیں آتا کہ بڑی جماعت دوسری چھوٹی جماعتوں کے جماعتی خیالات کے بھڑکنے پر بلند آہنگی سے ملامت کرے جبکہ یہ خیالات فی الحقیقت اُسی جماعتی اصول پر بطور احتجاج کے بھڑکے ہوں جس اصول کے عملی شکل اختیار کرنے سے وہ چھوٹی جماعتیں حقوق سے خارج کر دی جایا کرتی ہیں۔ لیکن چھوٹی جماعتوں کو یہ خیال کرنا چاہیئے کہ آیا اُن کی یہ عادۃ تو حد سے زیادہ نہیں ہوگئی ہے کہ ہر ایک معاملہ کو خواہ وہ کسی صورت یا وضع کا ہو وہ فرقہ بندی کی نگاہ سے دیکھا کرتی ہیں اور بڑی

جماعت کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے کہ اس فرقہ بندی کے خیال کا کہیں خود اُنکا طرزِ عمل تو ذمہ دار نہیں ہے۔ جبتک باہمی بے اعتمادی اور عداوت باقی رہیگی کسی اصلی ترقی کی اُمید نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ ترقی تو صرف عمل کے اتحاد ہی سے ممکن ہی۔ اگر اختلاف کی تمام نوعیتوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا مبالغہ نہوگا کہ اس کی بنیاد جس قدر زیادہ اقتصادی ہی ویسی سیاسی نہیں اور مذہب کی رو سے تو یقیناً وہ حقیر ہی۔ عام حصولِ منفعت کی جدوجہد کے یہ نتائج ہیں۔ اِن دوامی جھگڑوں کے جن کے پیچھے ہمیشہ کے چھوٹے چھوٹے اور نمایاں شکایتوں کا سلسلہ لگا رہتا ہی دور کرنے کی صرف یہی قابلِ عمل صورت ہی کہ ہر شہر اور قصبہ میں ثالثی کے بورڈ سب کی رضامندی سے پورے با اختیار قایم کیئے جائیں جو متعارض دعاوی اور سب جھگڑوں کا جو پیدا ہوں قطعی ناطق فیصلہ کردیا کریں۔ لیکن اس کے واسطے زمین اس طرح تیار کی جائے کہ جماعتوں میں بہتر معاشرتی تعلقات پیدا کیئے جائیں تقریبوں اور تیوہاروں میں اور روزمرہ کے کاموں میں باہم مواخاۃ اور میل جول زیادہ بڑھایا جائے

مختلف جماعتوں کے ذمہ دار لیڈروں کا یہ فرض ہی کہ وہ یہ دیکھیں کہ اُن کے افعال و اقوال سے وہ اپنے پیروان کو گمراہ تو نہیں کر رہے ہیں یا اُنکی جماعتی عداوتوں کو بھڑکا تو نہیں رہے ہیں۔ بد قسمتی سے بعض وقت سیاسی نقطہ ہائے نظر یا انتخاب کی جدوجہد حصول رائے کی کشمکش میں قومی محسوسات مشتعل کیئے جاتے ہیں۔ سیاسی احرار خیال کرتے ہیں کہ قومی تعصب کا ساز بجانے اور آئندہ پیش آنیوالے برسر رسیدہ جماعتی جھگڑے کے چھکڑے کو حرکت میں لانے سے اُن کو غالب جماعت کی مدد حاصل ہوجائے گی۔ چونکہ لوگوں کے دلوں میں شکوک موجود ہیں ایسے آتش زن لیڈروں کو متوسط الخیال لیڈروں کے مقابلہ میں زیادہ مدد ملجاتی ہی۔ چنانچہ ہم ایک بدخیال حلقہ میں رہتے ہیں۔ لیڈروں کو یہ یقین ہی کہ فرقہ بندی کے خیال انتخاب میں زیادہ اثر کرتے ہیں لہذا وہ ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں جن سے جماعتی تلخی اور زیادہ جوشزن ہو۔ جماعتیں اپنے احرار لیڈروں کے مواعظ پر کاربند ہوکر ان احرار لیڈروں کی جماعتی نگاہ کو اور زیادہ تنگ کر دیتی ہیں۔ چنانچہ اس سب کا یہ نتیجہ ہوتا ہی کہ ہندوستان کی مختلف جماعتوں کے افتراق کی خلیج جواب بھی حد سے زیادہ عریض ہی اور زیادہ عریض ہوتی چلی جاتی ہی لیکن حالت کی تبدیلی کا اب وقت یقیناً آپہونچا ہی اور وہ قدم جو ہم کو دور اور دور لیے جارہے تھے اب پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ ہر روز کی زندگی میں تمدنی رشتوں کے اندر اصلاح اور باہمی برتاؤ میں دوستانہ لحاظ اِس مسئلہ کا حل ہی مختلف جماعتوں میں کثرت سے تمدنی میل جول ہی صرف دوستانہ جذبات اور باہمی نیک ارادے کو پیدا کرسکتا ہی۔

خاتمہ

ہندوستان میں خدا ہی کی طرف سے مذاہب سہ گانہ یعنی ہندو۔ عیسائی اور اسلام کا اختلاط ہی ان تینوں کے قریبی میل جول کا یہ مقتضا ہی کہ اس ملک میں اُس رواداری سے جو دنیا کے دوسرے حصوں میں دیکھی جارہی ہی زیادہ رواداری ہو۔ اگر ہم اپنے درمیان ملکی حب الوطنی کی روح پھونکیں۔ ایک دوسرے کے محسوسات کا لحاظ رکھیں اور ایک دوسرے کے مذہب کی عزت کریں تو کوئی مغائرت باقی نہیں رہ سکتی ہز مجسٹی امیر امان اللہ خاں (دام ملکہ) کے یہ عالی قدر الفاظ ہیں "اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے مذہب کی عزت کیجائے تو ضرور بالضرور ہم کو دوسرے مذاہب کے اعتقادات کا احترام کرنا چاہیئے"۔ پس مختلف مذاہب کے درمیان صلح ہوجانی چاہیئے ہمکو چاہیئے کہ دوسروں کے ساتھ اپنے مذہب کے زیادہ رَوادار بنائیں۔ اُن اختلافات کا جو ہمیشہ موجود رہا کرتے ہیں ہمکو کم خیال کرنا چاہیئے مصالحت کے اُمور پر ہمکو متحد ہوکر زیادہ لحاظ کرنا لازم ہی۔ آؤ ہم سب ملکر رواداری کے خیال کو بڑھائیں۔ دوسروں کے اعتقادات کا احترام کریں اُن عقائد کی وجہ سے اُن کی عزت کریں گو ہم کو کتنے ہی راستہ سے ہٹے ہوئے وہ معلوم ہوں۔ دلوں میں عداوت کے خیالات کو جگہ نہ دیں نفرت و دشمنی نہ کریں محبت و اخلاص کو ترقی دیں۔ سب جماعتوں کو لازم ہی کہ ایک دوسرے کے ساتھ بہتر رشتے پیدا کریں دست اندازی و اشتعال دہی نے بچپن اور فی الحقیقت اس کے یہ معنی کبھی نہ ہونگے کہ ہم نے اپنے جائز حقوق و مراعات سے دست کشی کرلی ہی۔

بدون کامل میل جول۔ باہمی نیک نیتی۔ اتحاد عمل اور بغیر یکجائی۔ ایمانداری۔ راست بازی اور انصاف کے ملک کی ترقی رک جائیگی اور اُس کا نشو ونما مسدود ہوجائیگا۔ آؤ ہم تعصب۔ تنگ خیالی کو چھوڑ دینے کا عزم بالجزم کرلیں ایک دوسرے کے ساتھ انصاف کرنے کی سعی کریں گزشتہ مناقشات کو فراموش کردیں آئندہ ایک دوسرے پر الزام نہ لگائیں آؤ ہم ملکر اور ملک کا فائدہ مدِ نظر رکھکر کام کریں تاکہ ترقی حاصل ہو۔ اور آنیوالی نسلوں کے واسطے اس سے زیادہ بہتر ترکہ چھوڑیں جیسا ہم نے خود پایا ہی۔ ماضی کی تمام مایوسیوں کے باوجود تمامی خطرات اور عداوتوں کے باوجود جو پچھلے چند سالوں سے موجود رہی ہیں اور تمام خوفناک بلووں اور خونریزی کے باوجود جس نے دنیا کی نظریں ہم کو ذلیل کردیا ہی اب بھی یہ اُمید باقی ہی کہ ملک کی دوراندیشی غالب آئیگی اور ہم موجودہ جماعتی طوفان سے اُبھرینگے اور اُن افعال سے باز رہینگے جو ناشائستہ نیم وحشیوں کے شایان ہیں اور نہ جھجکنے والے عزم کے ساتھ ترقی کے راستہ پر قدم بڑھائینگے دل اور دماغ ۔ آسمانی مدد سے اتحاد مقصد کے حصول کیلئے جو عظیم الشان بھی ہی اور اہم بھی پُر از امید ہونگے فقط